عالمی تناظر

2016ء

دستاویز نمبر 2

35 ویں کانگریس 2016ء

فہرست

ایک نیا بحران منڈلا رہا ہے
عالمی قرضے اور برِکس (BRICS)
چین کا مسئلہ
عالمی تجارت
نابرابری
مستقل کٹوتیاں
بحران کے سیاسی اثرات
امریکہ
یورپ
ڈانلڈ ٹسک کی پیش گوئیاں
برطانیہ
بورژوازی کی غلط فہمیاں
یورپ اور مہاجرین کا بحران
عالمی تعلقات

روس اور امریکہ
مشرق وسطیٰ
سعودی عرب اور یمن
ترکی
اسرائیل
چین کا ابھار
پاکستان، افغانستان اور بھارت
جنوبی افریقہ
وینزویلا اور اصلاح پسندی کی حدود
طریقہ کار اور عوامی تنظیمیں
ایک نیا دور
نتیجہ

عالمی تناظر 2016ء

1۔سال 2016ء کا آغاز چین میں سٹاک ایکسچینج کی تیز گراوٹ سے ہوا جو پوری دنیا میں پھیل گئی۔اس سے سرمایہ کاروں کی پریشانی کی غمازی ہوتی ہے۔ یہ اضطراب بورژوازی کے اس خوف کا اظہار ہے کہ دنیا ایک نئے معاشی بحران کی طرف جارہی ہے۔سرمایہ داری کی تاریخ معاشی عروج اور زوال (Booms & Slumps) کی تاریخ ہے۔ یہ چکر سرمایہ داری کے خاتمے تک جاری رہے گا جس طرح موت کے وقت تک ایک شخص کی سانسیں جاری رہتی ہیں۔تاہم ان واقعات کے علاوہ طویل ادوار کی معاشی نمو اور گراوٹ بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ہر دور کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں جو طبقاتی جدوجہد پر فیصلہ کن انداز میں اثر ڈالتی ہیں۔

2۔کونڈراٹیو (Kondratiev) جیسے لوگ اور ان کے جدید نقالوں نے اس عمل کو ایک میکانکی انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔کونڈراٹیو کے نظریات آج کل زیادہ فیشن ایبل ہوگئے ہیں کیونکہ ان کے مطابق ہر گراوٹ کے بعد ناگزیر طور پر لمبے عرصے کی معاشی بحالی آتی ہے۔ یہ خیالات بورژوا معیشت دانوں کو کچھ تسکین دیتے ہیں جو اس بحران کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے دماغ کھپا رہے ہیں تاکہ کوئی راستہ تلاش کریں۔

3۔موجودہ عالمی صورتحال ہر سطح پر (معاشی، مالی، سماجی، سیاسی، سفارتی اور عسکری) بحرانات سے ماخوذ ہے۔بحران کی سب سے اہم وجہ سرمایہ داری کی عالمی سطح پر پیداواری قوتوں کو ترقی دینے میں نااہلی ہے۔ OECD (ترقی یافتہ صنعتی ممالک کی تنظیم) کے خیال ہے کہ اگلے پچاس سالوں تک کوئی خاطر خواہ معاشی ترقی نہیں ہوگی۔پھر بھی معاشی اتار چڑھاؤ کا عمل جاری رہے گا لیکن عمومی رجحان معاشی تنزلی کا ہی ہوگا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ عوام دہائیوں تک منجمد یا گرتے ہوئے معیار زندگی کا سامنا کریں گے اور نام نہاد ترقی پذیر ممالک میں حالات اس سے بھی بدتر ہوں گے۔ یہ طبقاتی جدوجہد کا ایک مکمل نسخہ ہے۔

4۔ایک نیا بحران منڈلا رہا ہے

5۔سرمایہ دارانہ پالیسی سازوں کے زیادہ سنجیدہ حلقے بھی وہی نتائج اخذ کر رہے ہیں جو مارکسسٹوں نے اخذ کئے تھے البتہ وہ کچھ تاخیر سے اور اپنے طبقاتی نکتہ نظر سے ایسا کر رہے ہیں۔ بورژوا معیشت دانوں کی قنوطیت کا اندازہ ان کی ''طویل جمود'' (Secular Stagnation) کی پیش گوئی سے ہوتا ہے۔آئی ایم ایف نے خبردار کیا ہے کہ دنیا کی بہت سے بڑی معیشتوں کو کمتر شرح نمو کے ایک طویل دور کے لیے تیار رہنا چاہیے۔انہوں نے کہا ہے کہ عالمی مالیاتی بحران پچھلے بحرانات کی نسبت زیادہ خطرناک تھا اور اس کے دوررس نتائج مستقل کم شرح نمو کی شکل میں برآمد ہوں گے۔

6۔آئی ایم ایف کی رپورٹیں مایوسی سے بھری ہوئی ہیں۔انہوں نے بار بار اپنی پیش گوئیوں (Forecasts) کو نیچے گرایا ہے۔ 2012ء کی پیش گوئیوں کی نسبت آئی ایم ایف نے 2020ء کے امریکی جی ڈی پی کے تخمینے کو 6 فیصد کم کیا ہے۔یورپ کے لیے 3 فیصد، چین کے لیے 14 فیصد، ابھرتی ہوئی منڈیوں کے لیے 10 فیصد اور مجموعی طور پر پوری دنیا کے لیے 6 فیصد کمی کی گئی ہے۔صنعتی ممالک میں پچھلے چار سالوں میں شرح نمو 2 فیصد سے آگے نہیں بڑھی۔

7۔آئی ایم ایف کا اندازہ ہے کہ امیر ممالک میں طویل مدتی شرح نمو 2015ء سے 2020ء کے دوران سالانہ اوسط 1.6 فیصد رہے گی (2001ء سے 2007ء کے دوران 2.2 فیصد تھی)۔یقیناً اس کا مطلب تو یہ ہے کہ کوئی معاشی گراوٹ نہیں ہوگی لیکن یہی وہ مطلب ہے جو اخذ نہیں کیا جانا چاہئے۔تمام واقعات عالمی سطح پر ایک نئے اور گہرے معاشی بحران کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔

8۔آئی ایم ایف کی سربراہ کرسٹین لیگارڈ کے الفاظ میں، ''اس کے علاوہ، وسط مدتی نمو کے امکانات کمزور ہو گئے ہیں۔'نئی متوسط شرح نمو' (New Mediocre) یعنی طویل مدت تک کم شرح نمو کا خطرہ، جس کے بارے میں میں نے ایک سال پہلے خبردار کیا تھا، کے امکانات بڑھ گئے ہیں۔ بھاری قرضے، کم سرمایہ کاری اور کمزور بینک کچھ ترقی یافتہ معیشتوں، بالخصوص یورپ پر

بوجھ بن رہے ہیں اور بہت سی ابھرتی معیشتیں بعد از بحران سرمایہ کاری اور قرضوں کے ابھار کے بعد ایڈجسٹمنٹ کا سامنا کر رہی ہیں۔''

9۔ لیگارڈ نے خبردار کیا کہ چینی معیشت کی سست روی ان ممالک پر اثرات مرتب کرے گی جو اپنے خام مال کے لیے چین کی طلب پر انحصار کرتے ہیں۔ اس نے کہا کہ طویل عرصے تک، بالخصوص اجناس (Commodity) برآمد کرنے والے بڑے ممالک میں، اجناس کی قیمتیں کم رہنے کے امکانات ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ کم پیداواریت نمو کو روک رہی ہے۔ لیکن یہ ایک ایسی وضاحت ہے جو کسی چیز کی وضاحت نہیں کرتی۔

10۔ لیگارڈ نے خبردار کیا کہ ''خطرات بڑھ رہے ہیں۔ ہمیں نئے نسخے کی ضرورت ہے۔'' بدقسمتی سے وہ یہ نہیں بتاتی کہ یہ نیا نسخہ کیسا ہوگا۔ لیکن عالمی مالیاتی ادارے (IMF) نے اپنے نسخوں کی کتاب کھولی ہوئی ہے جس کے ایک صفحے پر ایک پرانا نسخہ لکھا ہوا ہے جس میں ابھرتی منڈیوں کے سیاست دانوں سے کہا گیا ہے کہ وہ ''سٹرکچرل اصلاحات لاگو کریں'' یعنی اپنی منڈیوں کو کھول دیں تاکہ بیرونی سرمایہ دار انہیں لوٹ سکیں، ریاستی اداروں کی نجکاری کریں اور محنت کی منڈی کو مزید ''لچک دار'' بنائیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اقدامات کریں جو ملازمتوں، اجرتوں اور حالات کار پر مزید حملوں پر منتج ہوں۔

11۔ اس بحران کے خمیر میں ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ پیداواری سرمایہ کاری، جو کسی معاشی نمو کی بنیاد ہے، گر رہی ہے۔ یہ اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ موجودہ سست معاشی بحالی کے جاری رہنے کے باوجود سرمایہ کاری قبل از بحران کی سطح سے نیچے رہے گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عالمی سطح پر سرمایہ داری اپنی آخری حدود کو پہنچ چکی ہے بلکہ درحقیقت اس سے بھی آگے نکل چکی ہے۔ اس حقیقت کا اظہار بے تحاشا قرضوں کی صورت میں ہوتا ہے جو پچھلے دور سے وراثت میں ملے ہیں۔ سالوں تک ملٹی نیشنل کمپنیوں نے ''ابھرتی معیشتوں'' میں بھاری سرمایہ کاری کی لیکن اب زائد پیداوار (''زائد پیداواری صلاحیت'') کے ان معیشتوں کو متاثر کرنے کی وجہ سے یہ عمل سست ہو گیا ہے۔

12۔ سرمایہ داروں کا نظام پر سے اعتماد اٹھ چکا ہے۔ ان کے پاس کھربوں ڈالر ایسے ہی

پڑے ہوئے ہیں۔ پیداوار کو بڑھانے کے لیے سرمایہ کاری کرنے کی کیا ضرورت ہے جب وہ پہلے سے موجود پیداواری صلاحیت کو استعمال کرنے سے قاصر ہیں؟ کمتر سرمایہ کاری کا مطلب محنت کی پیداواریت کا منجمد ہونا ہے۔ امریکہ میں پیداواریت سالانہ انتہائی کم شرح یعنی 0.6 فیصد کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔ سرمایہ دار صرف منافع کے لیے سرمایہ کاری کرتے ہیں لیکن اس پیداوار کو بیچنے کے لیے منڈیوں کا ہونا لازمی ہے۔ پیداواریت کو بڑھانے کے لیے کافی سرمایہ کاری کے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عالمی سطح پر زائد پیداوار کا بحران ہے۔

13۔ نئی فیکٹریوں، مشینری اور ٹیکنالوجی میں سرمایہ کاری کرنے کی بجائے وہ پیداواریت کو بڑھانے کے لیے ہر جگہ حقیقی اجرت کو انتہائی نچلی سطح پر لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اس سے طلب کو کم کر کے صرف تضادات کو مزید بڑھاوا دے رہے ہیں جس سے سرمایہ کاری میں مزید گراوٹ ہو رہی ہے۔

14۔ آئی ایم ایف کے تخمینوں کے مطابق سال 2015ء سے 2020ء کے درمیان ترقی یافتہ ممالک کی مجموعی قومی پیداوار کی شرح نمو 1.6 فیصد رہے گی۔ یہ پچھلے سات سالوں کی شرح نمو سے کچھ ہی زیادہ ہے لیکن قبل از بحران کی شرح نمو سے بہت ہی کم ہے جب مجموعی قومی پیداوار سالانہ 2.25 فیصد کی شرح سے بڑھ رہی تھی۔ جب ہم جدید صنعت، سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے پناہ صلاحیتوں سے موازنہ کریں تو یہ اعداد و شمار اور بھی کم معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اب معیشت بہت کمزور ہے اور یہ کم شرح نمو کا تناظر بھی غیر یقینی ہے۔

15۔ گرتی ہوئی قیمتیں اور کم شرح سود جو عام حالات میں اچھی خبریں ہیں اب جان لیوا حد تک خطرناک ہیں۔ یہ معاشی سست روی اور گرتی ہوئی طلب کی عکاسی کرتے ہیں۔ پچھلی ایک دہائی سے شرح سود مسلسل گرتی رہی ہے۔ یہ اب کمترین سطح تک پہنچ چکی ہے، حتیٰ کہ منفی میں داخل ہو چکی ہے۔ بینک آف انگلینڈ کے چیف اکانومسٹ اینڈی ہیلڈین کے مطابق یہ پچھلے پانچ ہزار سال کی سب سے کم شرح سود ہے۔

16۔ بورژوا معیشت دانوں کے مطابق کم شرح نمو، کم افراط زر اور صفر شرح سود وہ چیزیں ہیں جو طویل معاشی جمود (Secular Stagnation) کو جنم دیتی ہیں۔ صنعتی ممالک کی

معیشتیں رینگ رہی ہیں لیکن یہ زیادہ عرصے تک اس طرح بھی نہیں چل سکتیں۔ سرمائے کے پالیسی سازوں کے مطابق عالمی معیشت کو لاحق خطرات 2008ء میں لیمن برادرز کے دیوالیہ ہونے کے وقت کے خطرات سے بھی زیادہ شدید ہیں۔

17۔ بورژوا طبقے کی پریشانی ستمبر 2015ء میں اینڈی ہیلڈن کی تقریر میں واضح نظر آتی ہے۔ اس نے خبردار کیا ''حالیہ واقعات بحرانوں کے ایک مثلث کو تشکیل دیتے ہیں۔ مثلث کا پہلا حصہ 9-2008ء کا اینگلو سیکسن بحران تھا۔ دوسرا حصہ 12-2011ء کا یورو بحران تھا اور اب ہم اس مثلث کے تیسرے مرحلے کی طرف بڑھ رہے ہیں جو 2015ء کے بعد کے 'ابھرتی معیشتوں' کا بحران ہے۔''

18۔ بورژوا طبقے کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلے سے ہی وہ تمام ذرائع استعمال کر لیے ہیں جو معاشی گراوٹ سے نکلنے یا اس کے اثرات کو کم کرنے کے لیے درکار ہیں۔ جب اگلی معاشی گراوٹ وقوع پذیر ہوگی (اور یہ 'اگر' کا نہیں بلکہ 'کب' کا سوال ہے) تو ان کے پاس اس سے نمٹنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ شرح سود بہت ہی کم ہے اور بھاری قرضوں کی موجودگی میں ریاست کی طرف سے معیشت میں مزید پیسے ڈالنے کے امکانات نہیں ہیں۔ جیسا کہ مارٹن وولف نے کہا ہے ''اس طرح کے حالات سے نمٹنے کے لیے فوری طور پر کوئی آلہ نہیں ہے۔''

19۔ عالمی قرضے اور برِکس (BRICS)

20۔ بحران کے آغاز سے عالمی قرضے دراصل بڑھ گئے ہیں۔ متوقع مالیاتی بحالی عالمی معیشت کے صرف چند حصوں میں ہی وقوع پذیر ہوئی ہے۔ قرضے بے نظیر سطح تک پہنچ چکی ہیں۔ حکومتی قرضے صرف جنگوں کے دوران ہی اس سطح تک پہنچتے تھے نہ کہ امن کے دنوں میں۔ گھریلو اور کارپوریٹ قرضے کبھی بھی اس سطح تک نہیں پہنچے تھے۔ بحران سے پہلے قرضہ ہر جگہ بڑھ رہا تھا۔ امریکہ میں 2007ء میں یہ جی ڈی پی کے 160 فیصد اور برطانیہ میں تقریباً 200 فیصد تک پہنچ چکا تھا۔ پرتگال میں یہ 2009ء میں جی ڈی پی کا 226.7 فیصد ہو چکا تھا۔ 2013ء میں یہ ابھی بھی 220.4 فیصد پر کھڑا تھا۔ امریکہ میں فی الحال قرضہ جی ڈی پی کا 269 فیصد ہے۔ تاریخ میں

صرف ایک مرتبہ ہی یہ اس سطح پر پہنچا تھا۔ یہ 1933ء میں تھا جب یہ 258 فیصد تک پہنچا جس کے بعد تیزی سے 180 فیصد تک پہنچ گیا۔

21۔ کٹوتیوں / آسٹیریٹی کا تمام تر مقصد قرضوں بالخصوص ریاستی قرضوں کو کم کرنا تھا۔ لیکن اعداد و شمار کچھ اور ہی کہانی سناتے ہیں۔ مک کینسے گلوبل انسٹی ٹیوٹ کی فروری 2015ء کی رپورٹ میں ہم دیکھتے ہیں کہ عالمی قرضے میں 2007ء کے بعد 57 ہزار ارب ڈالر کا اضافہ ہوا ہے یعنی عالمی جی ڈی پی کے 269 فیصد سے 286 فیصد ہو گیا ہے۔ عالمی معیشت کے ہر شعبے میں یہی کچھ ہو رہا ہے لیکن خاص طور پر حکومتی قرضے، جو 9.3 فیصد سالانہ کے حساب سے بڑھ رہے ہیں۔ قرضوں کی شرح میں یہ اضافہ عملی طور پر ہر ایک ملک میں ہو رہا ہے۔ صرف چند ممالک، جو چین یا تیل کی قیمتوں پر منحصر تھے، ہی اپنے قرضوں کو کم کر رہے تھے لیکن پچھلے دو سالوں میں یہ عمل بھی اچانک رک گیا ہے۔ قرضوں کا یہ وسیع پہاڑ عالمی معیشت پر ایک بوجھ ہے جو طلب کو کم کر کے پیداوار میں گراوٹ لا رہا ہے۔

22۔ برِکس (BRICS) کی تمام معیشتیں بحران کی زد میں ہیں۔ برازیل، ہندوستان اور روس مشکلات میں گھرے ہیں۔ دراصل برازیل اور روس معاشی بحران کا شکار ہیں۔ نام نہاد ابھرتی منڈیوں کی معاشی گراوٹ ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک کی نسبت زیادہ تیز ہو سکتی ہیں۔ آئی ایم ایف نے پیش گوئی کی ہے کہ ان کے جی ڈی پی کی شرح نمو جو 2008ء سے 2014ء کے دوران سالانہ 6.5 فیصد تھی اب اگلے پانچ سالوں میں 5.2 فیصد تک گر جائے گی۔

23۔ ان معیشتوں کی گروتھ کی وجہ سے ہی 2008ء کا بحران عالمی معیشت کی ایک زیادہ گہری گراوٹ میں تبدیل نہیں ہوا۔ پچھلے پانچ سالوں کے دوران کل عالمی معیشت کی نمو میں ابھرتی منڈیوں کا حصہ 80 فیصد تھا۔ ان منڈیوں، بالخصوص چین، نے قبل اور بعد از بحران عالمی معیشت کے انجن کا کردار ادا کیا۔ پچھلے عرصے میں یہ سرمایہ کاری کا ایک اہم میدان تھا جب مغرب میں منافع کمانے کے ذرائع بہت کم تھے۔

24۔ لیکن اب یہ عمل اپنے الٹ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ عالمی سرمایہ داری کو سہارا دینے کے عامل سے اب یہ ایک خطرے میں تبدیل ہو چکا ہے جو پوری عالمی معیشت کو ڈبو سکتا ہے۔ صرف

روایتی طور پر ترقی یافتہ معیشتوں میں ہی قرضے ڈرامائی انداز میں نہیں بڑھے۔ ابھرتی منڈیوں کے قرضے بھی بے نظیر حد تک بڑھ گئے ہیں۔ مک کنسے کی رپورٹ کے مطابق 2013ء کے اختتام تک ''ابھرتی منڈیوں'' کا کل قرضہ 49 کھرب ڈالر تک پہنچ گیا جو 2007ء کے بعد سے عالمی قرضوں میں اضافے کا 47 فیصد ہے۔ یہ 2000ء سے 2007ء کے دوران قرضوں میں ہونے والے اضافے میں اس کے حصے کا دوگنا ہے۔

25۔ آئی ایم ایف کے مطابق 2014ء میں ابھرتی منڈیوں کے پاس موجود فارن کرنسی یا زرمبادلہ کے ذخائر کو (جو سرمایے کے بہاؤ کا اہم پیمانہ ہے) 1995ء میں ریکارڈ کے آغاز کے بعد سے پہلی مرتبہ سالانہ زوال کا سامنا ہے۔ سرمائے کا یہ اندرونی بہاؤ خون کے بہاؤ کی مانند ہے جس کی کسی شخص کو ضرورت ہو۔ انفراسٹرکچر اور پیداوار کے پھیلاؤ کے دوران سرمائے کے مسلسل بہاؤ کے بغیر ابھرتی ہوئی معیشتوں کے پاس اپنے قرضے ادا کرنے اور خسارہ پورا کرنے کے لیے پیسے نہیں ہوں گے۔

26۔ بی بی سی نے انٹرنیشنل سینٹر فار مانیٹری اینڈ بینکنگ سٹڈیز کے اعداد و شمار بھی نقل کیے ہیں:

27۔ ''2008ء سے ترقی پذیر ممالک، بالخصوص چین نے قرضوں میں بہت اضافہ کیا ہے۔ چین کے معاملے میں رپورٹ کا کہنا ہے کہ قرضوں میں اضافہ بہت 'شاندار' ہے۔ مالیاتی کمپنیوں کو چھوڑ کر یہ قرضے 72 فیصد بڑھے ہیں جو کسی بھی ابھرتی ہوئی معیشت کے مقابلے میں بہت زیادہ شرح ہے۔ رپورٹ کا کہنا ہے کہ ترکی، ارجنٹائن اور تھائی لینڈ میں بھی قرضے بہت بڑھ گئے ہیں۔

28۔ ''رپورٹ کے مصنفین کے لیے بالخصوص ابھرتی ہوئی معیشتیں بہت ہی تشویش کا باعث ہیں۔ 'یہ ممالک اگلے بحران کے مرکز ہوں گے۔ اگرچہ ترقی یافتہ منڈیوں میں قرضوں کی سطح بلند تر ہے، ابھرتی ہوئی معیشتوں، اور بالخصوص ایشیا، میں قرضے بڑھنے کی موجودہ رفتار باعث تشویش ہے۔''

29۔ سرمائے کا اخراج سب سے زیادہ ان ممالک میں سے ہو رہا ہے جہاں قرضے سب

سے زیادہ تیزی سے بڑھے۔ مثلاً جنوبی کوریا میں 2007ء اور 2013ء کے دوران قرضے اور جی ڈی پی کا تناسب 45 فیصد بڑھا جبکہ چین، ملائیشیا، تھائی لینڈ اور تائیوان میں قرضے بالترتیب 83 فیصد، 49 فیصد، 43 فیصد اور 16 فیصد بڑھے۔

30۔ یہ معیشتیں بھی سست روی یا کساد بازاری کا شکار ہیں اور آنے والے وقت میں گہری عالمی معاشی گراوٹ (Slump) کا سامان کر رہی ہیں۔

31۔ چین کا مسئلہ

32۔ سب سے پریشان کن بات یہ ہے کہ چینی معیشت تیزی سے سست روی کا شکار ہے۔ ابھرتی ہوئی معیشتوں کی سست روی کی ایک وجہ ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ معیشتوں میں طلب میں طویل عرصے کی گراوٹ اور دوسری وجہ چین کا زوال ہے۔ یہ منظر نامہ مستقل کمزور عالمی تجارت پر منتج ہوسکتا ہے۔ جدلیاتی طور پر ہر چیز آپس میں جڑی ہوئی ہے۔ کمزور طلب اور منڈی کمزور پیداوار اور سرمایہ کاری پر منتج ہوتی ہے۔ کم سرمایہ کاری کمزور معاشی بحالی کو جنم دیتی ہے جو کمزور طلب پر منتج ہوتی ہے۔

33۔ چین میں صنعت کی دھماکہ خیز ترقی کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ 2010ء سے 2013ء کے دوران چین نے اس سے زیادہ کنکریٹ استعمال کیا جتنا امریکہ نے پوری بیسوی صدی کے دوران استعمال کیا۔ لیکن چینی صنعت کی اس دیوہیکل پیداواری صلاحیت کے مقابلے عالمی طلب میں اتنا اضافہ نہیں ہوا ہے جس کا ناگزیر نتیجہ زائد پیداوار کا بحران ہے۔

34۔ 2007ء تک عالمی طلب، بالخصوص امریکہ اور سپین میں، کو قرضوں اور گھروں کی تعمیر کے ذریعے ابھارا گیا۔ اس عمل کا انہدام ہوگیا اور چین نے انفراسٹرکچر اور بینکوں کے قرضوں میں اربوں ڈالر انڈیل کر اس طلب کو سہارا دیا۔ جی ڈی پی کے 40 فیصد کے برابر سرمایہ کاری کی گئی جس نے پیداواری قوتوں کو ترقی دی اور خام مال کے لیے طلب بڑھی۔ اس سے دیوہیکل زائد پیداواری صلاحیت بھی پیدا ہوئی۔

35۔ مغرب میں 2008ء میں بلبلوں کے پھٹنے کے بعد چینی ریاست نے معیشت میں

بڑی مقدا ر میں رقم داخل کرنا شروع کی۔ اس سے ایک دیو ہیکل قیاس آرائی (Speculation) کے بلبلے اور چینی معیشت میں ہر سطح پر قرضوں کے وسیع اجتماع نے جنم لیا۔ یہ بلبلہ پھٹنے والا ہے جس کے دوررس نتائج ہوں گے۔ چین بھی جاپان کے راستے پر چل رہا ہے یعنی طویل جمود کا راستہ۔ چین میں معاشی سست روی کی وجہ سے اجناس کی قیمتیں گر گئی ہیں جس سے ابھرتی ہوئی معیشتیں سخت متاثر ہوئی ہیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ چین پوری دنیا کی پیداوار کے 16 فیصد اور شرح نمو کے 30 فیصد کا احاطہ کرتا ہے۔ جب چین سست روی کا شکار ہوتا ہے تو پوری دنیا سست رو ہو جاتی ہے۔

36۔ چین میں زائد پیداوار کی وجہ سے سٹیل اور دوسری تیار کردہ مصنوعات متاثر ہو رہی ہیں۔ قرضوں کا بے تحاشا اجتماع ہوا ہے اور خطرہ ہے کہ حد سے زیادہ بڑھی ہوئی پراپرٹی مارکیٹ منہدم ہو جائے گی۔ خام لوہے کی ایک ہزار سے زائد کانیں مالیاتی انہدام کے قریب ہے۔ فنانشل ٹائمز نے پیش گوئی کی ہے: ''خاص طور پر چین کی قومی پیداوار کی نمو میں تیز سکڑاؤ آ سکتا ہے کیونکہ چین اپنی معیشت کو سرمایہ کاری سے ہٹا کر کھپت کی طرف لے جا رہا ہے۔''

37۔ چینی وزیر اعظم لی کیگیانگ نے امریکی سفیر سے کہا ہے کہ وہ معاشی ترقی کو جانچنے کے لیے تین چیزوں پر انحصار کرتا ہے: بجلی کا استعمال، ریل کی نقل و حرکت کا حجم اور بینک کے قرضے۔ اس بنیاد پر فیتھم (Fathom) میں معیشت دانوں نے اعداد و شمار کے تین سیٹ کے ذریعے ''چائنا مومینٹم انڈیکیٹر'' ترتیب دیا ہے۔ اس انڈیکیٹر سے یہ بات واضح ہے کہ حقیقی شرح نمو 2.4 فیصد تک ہو سکتی ہے۔ ریل کی نقل و حرکت کا حجم بہت کم ہے اور بجلی کا استعمال بڑھ نہیں رہا ہے۔ شرح نمو کے گرنے کی وجہ سے چین نے پچھلے بارہ مہینوں میں اپنی شرح سود چھ مرتبہ کم کی ہے۔ اپنی برآمدات کو بڑھانے کے لیے اس نے اپنی کرنسی کی قدر کو گرایا ہے جس سے امریکہ کے ساتھ اس کا تنازعہ مزید بڑھ گیا ہے اور ہر طرف عدم استحکام پیدا ہو گیا ہے۔

38۔ چین کی معاشی سست روی نے ابھرتی ہوئی معیشتوں کو بری طرح متاثر کیا ہے، بالخصوص وہ ممالک جو چین پر بہت زیادہ انحصار کرتے ہیں۔ چین کے معاشی سست روی کے خوف کو چین کے اندر بھی محسوس کیا جا رہا ہے بالخصوص سٹاک مارکیٹ میں گراوٹ کی شکل میں۔ حکام نے

منڈی کو مستحکم کرنے کے لیے 200 اَرب ڈالر انڈیل کر مداخلت کی لیکن بعد میں انہیں پیچھے ہٹنا پڑا۔ سرمایہ کار ہیجان کی کیفیت میں ہیں۔ یونیورسٹی آف بیجنگ میں معاشیات کے پروفیسر تاؤران نے کہا ہے ''اگر ہم اصلاحات نہ کریں تو چینی معیشت منہدم ہو سکتی ہے۔ پچھلے بیس سے تیس سالوں کی حاصلات سب ضائع ہو جائیں گی۔''

39۔ جاپان کے دوسری سب سے بڑے بروکریج ہاؤس، ڈائیوا، کے ریسرچ ڈویژن نے وہ کام کیا جو آج تک کسی نے نہیں کیا اور ایک رپورٹ جاری کی جس میں عالمی مالیاتی تباہی (Meltdown) کو بہترین ممکنہ صورت حال قرار دیا گیا جو چین کی معاشی تباہی جیسی صورت حال سے جنم لے گی۔ اس میں مزید یہ کہا گیا کہ اس عالمی معاشی تباہی کے اثرات ''بدترین ہوں گے جسے آج تک دنیا میں کسی نے نہیں دیکھا ہوگا۔''

40۔ عالمی تجارت

41۔ عالمی معیشت کے لیے سب سے خطرناک بات تحفظاتی (Protectionist) رجحانات کا دوبارہ ابھار ہے۔ پچھلی دہائیوں میں عالمی تجارت کے ابھار اور عالمی تقسیم محنت (''گلوبلائزیشن'') میں اضافہ عالمی معیشت کی اہم موٹر فورس تھی۔ ان طریقوں کے ذریعے بورژوا طبقہ جزوی اور عارضی طور پر قومی ریاست کی حدود پر غالب آنے میں کامیاب ہو گیا۔ لیکن اب یہ سب کچھ اپنی ضد میں تبدیل ہو چکا ہے۔

42۔ اس کی سب سے درخشاں مثال یورپی یونین ہے جسے یورپی بورژوازی (جس کی شروع میں فرانس اور جرمنی اور اب صرف جرمنی قیادت کر رہا ہے) نے ایک واحد منڈی اور ایک واحد کرنسی، یورو، کے تحت متحد کرنے کی کوشش کی۔ مارکسسٹوں نے پیش گوئی کی تھی کہ یہ ناکام ہو جائے گا اور پہلے سنجیدہ معاشی بحران کے ابھرتے ہی تمام تر پرانی قومی تقسیم اور رقابتیں، جو واحد منڈی کی وجہ سے صرف پس پردہ چلی گئی تھیں لیکن ختم نہیں ہوئی تھی، دوبارہ سر اٹھائیں گی۔

43۔ یورو کا بحران، جو ڈالر کے مقابلے میں گر گیا ہے، معاشی بحران کی شدت کی عکاسی کرتا ہے۔ یونان کا بحران دراصل ایک ایسے بحران کا سب سے واضح اظہار ہے جو یورو کے انہدام اور

حتیٰ کہ یورپی یونین کی ٹوٹ پھوٹ پر منتج ہوسکتا ہے۔ اس طرح کی صورت حال پوری عالمی معیشت کے لیے نہایت خطرناک نتائج کی حامل ہوگی۔ اسی وجہ سے اوباما یورپ پر زور دے رہا ہے کہ یونان کے بحران کو ہر قیمت پر حل کریں۔ وہ خوب جانتا ہے کہ یورپی یونین کا انہدام خود امریکہ کے اندر بحران کو جنم دے گا۔

44۔ سال 2015ء مسلسل پانچواں سال تھا جس میں ''ابھرتی ہوئی معیشتوں'' کی اوسط شرح نمو تنزلی کا شکار رہی اور ساتھ ہی عالمی شرح نمو کو بھی اپنے ساتھ نیچے لے گئی۔ ڈبلیو ٹی او کے مطابق 2008ء سے پہلے عالمی تجارت کا حجم سالانہ 6 فیصد کے حساب سے بڑھتا رہا۔ پچھلے تین سالوں میں یہ اعشاریہ 2.4 فیصد تک گر گیا ہے۔ 2015ء کے پہلے چھ ماہ میں 2009ء سے لے کر اب تک کی سب سے بری کارکردگی دیکھنے میں آئی ہے۔

45۔ ماضی میں تجارت پیداوار کو بڑھاتی تھی لیکن اب ایسا نہیں۔ 2013ء سے عالمی شرح نمو کا ہر 1 فیصد تجارت میں صرف 0.7 فیصد اضافہ کر رہا ہے۔ امریکہ میں 2000ء سے مینوفیکچرنگ کی درآمدات کا جی ڈی پی میں حصہ بالکل نہیں بڑھا ہے۔ اس سے ایک دہائی پہلے یہ دو گنا بڑھا تھا۔

46۔ نتائج واضح ہیں۔ عالمگیریت کمزور ہو رہی ہے۔ معاشی ترقی کا انجن، عالمی تجارت، سست روی کا شکار ہے۔ مئی 2015ء میں عالمی تجارت کا حجم 1.2 فیصد گرا ہے۔ 2015ء کے پہلے پانچ مہینوں میں سے چار میں یہ حجم گرا۔ دوحہ مذاکرات پچھلے چودہ سالوں سے جاری ہیں اور اب اسے یکسر ترک کر دیا گیا ہے۔ اس کی بجائے امریکہ اپنے سامراجی مقاصد کی خاطر علاقائی آزاد تجارت کے بلاک بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔ حالیہ دنوں میں انہوں نے ٹرانس پیسفک پارٹنرشپ (TPP) کا معاہدہ کیا ہے جو عالمی معیشت کے 40 فیصد کا احاطہ کر سکتی ہے لیکن یہ تضادات سے بھری ہوئی ہے۔ اسے بہت سے ممالک، بشمول امریکہ، کی منظوری درکار ہے جو کسی طرح بھی یقینی نہیں ہے۔ اوباما کو ایک سرکش کانگریس کا سامنا ہے اور ممکن ہے کہ وہ اپنی مدت کے خاتمے تک بھی اسے منظور نہ کرا سکے۔

47۔نابرابری

48۔مارکس کی پیش گوئی کے عین مطابق سرمائے کا ارتکاز بے نظیر سطح تک پہنچ چکا ہے۔اس نے ان دیکھی نابرابری کو جنم دیا ہے۔مٹھی بھر امیر ترین خواتین وحضرات کے ہاتھوں میں بے پناہ طاقت مرتکز ہوئی ہے جو حقیقت میں دنیا کے لوگوں کی تقدیروں کا فیصلہ کرتے ہیں۔

49۔نوجوان،خواتین اور اقلیتی نسلیں بھی بحران سے حد سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں: یورپ میں سیاہ فام اور ایشیائی مزدور، امریکہ میں میکسیکن اور دوسرے لاطینی امریکی پناہ گزین۔یہی وہ لوگ ہیں جنہیں سب سے پہلے نوکریوں سے برخاست کیا جاتا ہے اور جن کی اجرتوں میں سب سے زیادہ کمی کی جاتی ہے۔بحران نابرابری اور جنسی تفریق کے اثرات کو بڑھاتا ہے اور ساتھ ہی آبادی کی پسماندہ پرتوں میں نسل پرستی، زینوفوبیا اور اقلیتی گروہوں کی طرف عدم برداشت کو جنم دیتا ہے۔

50۔نوجوانوں کو کئی نسلوں تک بدترین معاشی امکانات کا سامنا ہے۔تمام تر بورژوا معیشت دان اس بات کی تائید کرتے ہیں۔نوجوانوں کو آمدنی اور روزگار میں سب سے گہری گراوٹ کا سامنا ہے۔انہیں تعلیم کے میدان میں ہر سطح پر مسلسل حملوں کا سامنا ہے جسے مالیاتی سرمائے کے مفاد کی خاطر بے رحمی سے کٹوتی اور نجکاری کی بھینٹ چڑھایا جا رہا ہے۔یونیورسٹیاں تیزی سے ایک مراعات یافتہ طبقے کے لیے مخصوص ہوتی جا رہی ہیں۔

51۔نوجوانوں کی اکثریت سے وہ مواقع چھین لیے گئے ہیں جو ماضی میں ان کے حقوق سمجھے جاتے تھے۔یہ عدم استحکام کی سب سے اہم وجہ اور سماجی دھماکوں کا پیش خیمہ ہے۔یہ عرب بہار میں ایک اہم عامل تھا اور اسی طرح کی بغاوتیں ہر جگہ پک رہی ہیں۔

52۔ہر طرف غریب غریب تر اور امیر امیر تر ہو رہے ہیں۔اوکسفیم نے ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ عالمی دولت میں امیر ترین 1 فیصد کا حصہ 2009ء میں 44 فیصد سے بڑھ کر 2014ء میں 48 فیصد ہو گیا جبکہ غریب ترین 80 فیصد کے پاس صرف 5.5 فیصد دولت ہے۔2015ء کے اختتام تک امیر ترین ایک فیصد کی دولت باقی کی 99 فیصد

آبادی سے بڑھ چکی ہے۔

53۔ بورژوازی کا زیادہ ہوشیار حصہ امیر اور غریب کے درمیان اس خلیج سے نظام کو لاحق خطرات سے آگاہ ہے۔ OECD کا کہنا ہے کہ اس کی تحقیقات معیشت کے ساتھ ساتھ سماجی اور سیاسی سوالوں کو بھی مدنظر رکھتی ہیں۔ اوکسفیم انٹرنیشنل کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر وینی بیانیما نے کہا ہے کہ 2008-9ء کی گہری کساد بازاری کے بعد جنم لینے والی ارتکاز دولت ''خطرناک ہے اور اسے ختم کرنے کی ضرورت ہے۔''

54۔ نیک نیت اصلاح پسندوں نے عالمی رہنماؤں پر زور دیا ہے کہ انسانیت کو درپیش نابرابری، تفریق، سماجی بیگانگی، ماحولیاتی تبدیلی اور دوسرے مسائل کو حل کریں۔ لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ سرمایہ داری کے تحت ان مسائل کو کس طرح حل کیا جائے۔ مذاکرات اور کانفرنسیں ہوتی رہتی ہیں۔ تقریریں ہوتی ہیں۔ قراردادیں منظور ہوتی ہیں اور پھر کچھ بھی نہیں ہوتا۔

55۔ مستقل کٹوتیاں

56۔ تناظر طویل مدتی ہے جس میں معاشی زوال کے دوران کمزور معاشی بحالی کے ساتھ ساتھ روز افزوں معاشی مشکلات ہوں گی۔ دوسرے الفاظ میں مستقل کٹوتیاں ہوں گی۔ یہ ایک نیا منظرنامہ ہے جو ان حالات سے مکمل طور پر مختلف ہے جو دوسری عالمی جنگ کے بعد پچاس سال سے زائد عرصے تک ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں رہے ہیں۔ نتیجتاً سیاسی اثرات بھی بہت مختلف ہوں گے۔

57۔ ہم نے بار بار وضاحت کی ہے کہ بورژوازی کی جانب سے معاشی توازن کو ٹھیک کرنے کے لیے کیا گیا ہر اقدام سماجی اور سیاسی توازن کو بگاڑ دے گا اور یہی چیز عالمی سطح پر ہو رہی ہے۔ ایک طویل معاشی گراوٹ معاشی مشکلات پیدا کرتی ہے اور پرانے توازن کو بگاڑ دیتی ہے۔ پرانی راسخ باتیں ہوا ہو جاتی ہیں اور ہر طرف رائج الوقت اقدار اور نظریات پر سوالات اٹھائے جا رہے ہیں۔

58۔ 2008ء میں عالمی مالیاتی بحران کے آغاز سے اب تک 61 ملین نوکریاں ختم ہو چکی

ہیں۔آئی ایل او کے مطابق اگلے پانچ سالوں تک بے روزگار لوگوں کی تعداد مسلسل بڑھتی رہے گی اور 2019ء تک 212 ملین سے بھی تجاوز کر جائے گی۔اس کا دعویٰ ہے کہ ''عالمی معیشت ایک نئے دور میں داخل ہو چکی ہے جس میں کمزور نمو، روز افزوں نابرابری اور انتشار ایک ساتھ موجود ہیں۔'' اگر ہم غیر رسمی شعبے میں معمولی ملازمتوں پر لگے لوگوں کی بڑی تعداد کو شامل کر لیں تو عالمی سطح پر بیروزگاروں کی حقیقی تعداد 850 ملین سے کم نہ ہوگی۔صرف یہی عدد ہی اس بات کے اثبات کے لیے کافی ہے کہ سرمایہ داری ترقی کے راستے میں ایک نا قابل برداشت رکاوٹ بن چکی ہے۔

59۔ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک میں حکومتیں بحران کے دوران مجتمع شدہ قرضوں کو کم کرنے کے لیے اجرتوں اور پنشنوں میں کٹوتیاں کر رہی ہیں۔لیکن کٹوتیوں کی پالیسی قرضوں میں کوئی خاطر خواہ کمی کی بجائے معیار زندگی میں تیز گراوٹ ہی لائی ہے۔پچھلے سات سالوں میں عوام پر مسلط کردہ دردناک 'قربانیاں' بحران کو حل کرنے میں ناکام ہوگئی ہیں بلکہ اس کے برعکس اس سے معاملات مزید بگڑ گئے ہیں۔

60۔نہ تو کینشین اسٹ اور نہ ہی مانیٹرسٹ پالیسیوں کے دعویداروں کے پاس کوئی حل موجود ہے۔پہلے سے ناقابل برداشت قرضوں کی سطح بے رحمی سے بڑھ رہی ہے جو شرح نمو پر ایک بوجھ ہے۔حکومتیں اور کمپنیاں اپنے قرضوں کو کم کرنے کے لیے سارا وزن محنت کش طبقے اور مڈل کلاس پر لاد رہے ہیں۔یہ عمل سماجی تعلقات اور تمام طبقات کے شعور پر گہرے اثرات مرتب کر رہا ہے۔

61۔بحران کے سیاسی اثرات

62۔یہاں ہمیں بظاہر ایک ناقابل بیان معمہ کا سامنا ہے۔حالیہ دنوں تک بینکار اور سرمایہ دار ایک دوسرے کو مبارک بادیں دے رہے تھے کہ وہ انقلاب کے خطرے کو ابھارے بغیر ہی تاریخ کے سب سے گہرے بحران سے نکل آئے ہیں۔اس حیران کن نتیجے کی وجہ سے ان میں ایک اطمینان کا احساس جاگ اٹھا جو جتنا بے جا تھا اتنا ہی احمقانہ بھی تھا۔

63۔ان لوگوں کے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ان کو جدلیات کی ابتدائی سمجھ بوجھ بھی نہیں ہے جس

کے مطابق ہر چیز جلد یا بدیر اپنی الٹ میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ بظاہر پرسکون حالات کے نیچے سیاسی ٹولوں، امیروں، طاقتور اور مراعات یافتہ طبقات کے خلاف ایک غم وغصہ پک رہا ہوتا ہے۔ سٹیٹس کو کے خلاف یہ ردعمل انقلابی تبدیلیوں کے ابتدائی بیج ہوتے ہیں۔

64۔ یہ جدلیاتی مادیت کا بنیادی مفروضہ ہے کہ انسانی شعور حالات کے پیچھے چلتا ہے۔ لیکن جلد یا بدیر یہ ایک چھلانگ کے ساتھ اس سے ہم آہنگ ہوجاتا ہے۔ اسی چیز کو ہی انقلاب کہتے ہیں۔ ہمارے سامنے بہت سے ممالک میں سیاسی انقلاب کا آغاز ہورہا ہے۔ یہ سچ ہے کہ شعور بڑی حد تک ماضی کی یادوں سے تشکیل پاتا ہے۔ عوام کے شعور سے اصلاح پسندی کی غلط فہمیوں کو ختم ہونے میں وقت لگے گا۔ لیکن حالات و واقعات کے تھپیڑوں سے شعور میں تیز اور اچانک تبدیلیاں رونما ہوں گی۔ قابل رحم ہیں وہ لوگ جو اس ماضی کے شعور کو اپنی بنیاد بناتے ہیں جو پہلے ہی ذہنوں سے محو ہو چکا ہے۔ مارکسسٹوں کو زندہ عوامل اور آنے والے دور کے تناظر کو اپنی بنیاد بنانا چاہیے جو ہمارے آج تک کے تجربات سے بہت مختلف ہوگا۔

65۔ بحران سے نکلنے کے لیے عوام ایک کے بعد دوسری پارٹی کو آزمائیں گے۔ پرانی قیادت اور پروگراموں کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور پرے پھینک دیا جاتا ہے۔ وہ پارٹیاں جو منتخب ہوکر لوگوں کی امیدوں پر پانی پھیرتی ہیں اور اپنے انتخابی وعدوں سے منحرف ہوتی ہیں وہ تیزی سے اپنی ساکھ کھو دیتی ہیں۔ عمومی سمجھے جانے والے نظریات رسوا ہوجاتے ہیں۔ مشہور رہنما قابل نفرت بن جاتے ہیں۔ تیز اور اچانک تبدیلیاں روز کا معمول ہیں۔

66۔ سیاسی ٹولوں، امیروں، طاقتور اور مراعات یافتہ طبقات کے خلاف ایک روز افزوں غم وغصہ موجود ہے۔ سٹیٹس کو کے خلاف یہ غم وغصہ، جس میں انقلابی تبدیلیوں کے ابتدائی بیج موجود ہیں، معیشت میں بحالی کی پہلی علامات ظاہر ہونے کے بعد بھی جاری رہ سکتا ہے۔ سیاست دانوں کی باتوں اور وعدوں پر اب عوام مزید یقین نہیں کرتے۔ سیاسی اشرافیہ اور عمومی طور پر سیاسی پارٹیوں کے حوالے سے غلط فہمیاں تیزی سے دور ہورہی ہیں۔ سماج میں معاشی بے چینی کا ایک گہرا اور عمومی احساس موجود ہے۔ لیکن کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جو اسے ایک منظم اظہار دے سکے۔

67۔ فرانس میں، جہاں سوشلسٹ پارٹی نے پچھلے پارلیمانی انتخابات جیت لیے تھے،

فرانسوالاند 1958ء سے اب تک کی سب سے کم شرح حمایت والا صدر ہے اور حالیہ علاقائی انتخابات میں اس کی پارٹی کو بدترین شکست ہوئی ہے۔ یونان میں ہم نے پاسوک کا زوال اور سائریزا کا ابھار دیکھا۔ سپین میں پوڈیموس کا ابھار ہے۔ سکاٹ لینڈ میں ہم نے ایس این پی کا ابھار دیکھا۔ مجموعی طور پر پورے برطانیہ میں ہم نے جیرمی کوربین کا ابھار دیکھا۔ یہ سب واقعات سماج میں موجود گہری بے چینی کی غمازی کرتے ہیں جو سیاسی اظہار کا راستہ تلاش رہی ہے۔ پورے یورپ میں ایک خوف کا سماں ہے کہ کٹوتیوں کی پالیسیاں عارضی ایڈجسٹمنٹ نہیں بلکہ معیار زندگی پر مستقل حملے ہیں۔ یونان، پرتگال اور آئرلینڈ میں ان پالیسیوں کی وجہ سے، خسارے کے مسئلے کو حل کیے بغیر، اجرتوں اور پنشنوں میں گہری کٹوتیاں ہوئی ہیں۔ نتیجتاً لوگوں کی تمام تر محرومیاں اور مشکلات رائیگاں چلی گئی ہیں۔

68۔ یہی عمل ہم نے آئرلینڈ کے حالیہ ریفرنڈم میں دیکھا۔ آئرلینڈ صدیوں تک یورپ کا سب سے زیادہ کیتھولک ملک رہا۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب چرچ کو زندگی کے ہر شعبے پر مطلق اختیارات حاصل تھے۔ ہم جنس شادی کے اوپر ریفرنڈم کے نتائج، جس میں 62 فیصد نے حق میں ووٹ دیئے، رومن کیتھولک چرچ پر کاری ضرب تھی۔ یہ چرچ کی طاقت اور سیاست اور عوام کی زندگیوں میں اس کی مداخلت کے خلاف ایک وسیع احتجاج تھا۔ یہ آئرش سماج میں ایک بنیادی تبدیلی کا اظہار تھا۔

69۔ امریکہ

70۔ امریکہ واحد اہم سرمایہ دارانہ ملک تھا جس میں کم سے کم ایک معمولی سی معاشی بحالی ہوئی تھی تاہم اس کا کردار بہت ہی کمزور اور نحیف تھا۔ پچھلے سال ہونے والی نمو کا زیادہ تر حصہ انوینٹریز (غیر فروخت شدہ اجناس) کے اجتماع کی وجہ سے تھا۔ درحقیقت امریکہ میں معاشی شرح نمو سست روی کا شکار ہے اور جاپان اور یورپی یونین میں پہلے ہی سست روی کا شکار تھی۔ جولائی 2015ء سے آئی ایم ایف کی تمام تر پیشگوئیاں منفی ہیں۔ اس لیے اس بحالی کی کوئی وقعت نہیں ہے۔

71۔ عالمی معیشت اور بالخصوص نام نہاد ابھرتی ہوئی معیشتوں کی کمزوری کی وجہ سے سب ڈالر کی طرف دوڑ رہے ہیں جو بحرانی ادوار میں ایک محفوظ پناہ گاہ ہے۔ لیکن ڈالر کی اپنی طاقت خود امریکہ کے لیے ایک مسئلہ ہے کیونکہ اس سے اس کے حریفوں کو مسابقتی فائدہ ملتا ہے اور امریکی برآمدات متاثر ہوتی ہیں۔ پچھلے سال امریکہ میں برآمدات اور درآمدات گر گئیں جو عالمی معیشت کی عمومی کمزوری کا اظہار ہے۔

72۔ بحران سے امریکی سماج تقسیم ہو رہا ہے۔ اوباما انتظامیہ ناکام ہو چکی ہے۔ ڈونلڈ ٹرمپ اور برنی سانڈرز کی اسٹیبلشمنٹ مخالف باتوں کی امریکیوں میں پذیرائی لاکھوں لوگوں کی بیگانگی کا اظہار ہے۔ دائیں اور بائیں بازو کی ایک تقسیم موجود ہے اور یہ عمل پوری دنیا میں ہو رہا ہے۔

73۔ ٹرمپ کی رجعتی تقریروں کو واشنگٹن میں موجود سیاسی اشرافیہ سے بیزار لوگوں میں پذیرائی ملی ہے۔ پرائمری الیکشنوں (پارٹی کے داخلی انتخابات) میں اس کی کامیابی ریپبلکن پارٹی کی قیادت کے لیے ایک صدمہ تھا۔

74۔ امریکی صدارتی انتخابات ایک انتہائی دلچسپ پیش رفتہیں۔ امریکی سیاست کی انتہائی غیر مستحکم اور پرانتشار کیفیت کی وجہ سے یقین کے ساتھ اس کے نتائج کی پیش گوئی کرنا ممکن نہیں ہے۔ میڈیا نے ساری توجہ ریپبلکن ڈونلڈ ٹرمپ کی شخصیت پر مرکوز کی ہے۔ ایسا نہیں لگتا کہ امریکی حکمران طبقہ اپنے معاملات کو ایک رجعتی مسخرے اور جاہل شخص کے ہاتھوں میں تھما دے اگرچہ ماضی قریب میں انہوں نے دو مرتبہ (رانلڈ ریگن اور جارج بش) ایسا کیا ہے۔ حکمران طبقے کی سوچ کے حساب سے ہیلری کلنٹن بہتر جوا ہے۔

75۔ لیکن ٹرمپ یا کلنٹن سے زیادہ اہم برنی سانڈرز کو ملنے والی وسیع عوامی حمایت ہے جو کھلم کھلا سوشلزم کی بات کرتا ہے۔ برنی سانڈرز کا ڈیموکریٹک پارٹی کے نامزد صدارتی امیدوار کے امیدوار کے طور پر سامنے آنا سماج میں گہری بے چینی اور اضطراب کی علامت ہے۔ ارب پتی طبقے پر اس کے حملے اور اس کی ''سیاسی انقلاب'' کی باتیں لاکھوں لوگوں کی آرزوؤں سے مماثلت رکھتی ہیں جو ہزاروں کی تعداد میں اس کے جلسوں میں شرکت کرتے ہیں۔

76۔ ''سوشلزم'' کا لفظ مین سٹریم میڈیا میں اب زیادہ کثرت سے استعمال ہو رہا ہے۔ 2011ء میں رائے عامہ کے ایک سروے کے مطابق 18 سے 29 سال کے 49 فیصد لوگ سوشلزم کے بارے میں مثبت رائے رکھتے تھے جبکہ 47 فیصد لوگ سرمایہ داری کے بارے میں مثبت رائے رکھتے تھے۔ جون 2014ء کے ایک سروے کے مطابق 47 فیصد امریکی سوشلسٹ امیدوار کو ووٹ دیں گے۔ ان میں 69 فیصد کی عمریں تیس سال سے کم تھیں۔

77۔ لوگوں کی بڑی تعداد، جن کی اکثریت نوجوان تھے، برنی سانڈرز کی باتوں کو سننے کے مشتاق تھے۔ یہ سچ ہے کہ وہ حقیقی سوشلزم کی بجائے سکینڈ نیویا طرز کی سوشل ڈیموکریسی سے زیادہ قریب ہے۔ اس کے باوجود یہ ایک اہم علامت ہے کہ امریکہ میں حالات تبدیل ہو رہے ہیں۔

78۔ برنی سانڈرز نے اسٹیبلشمنٹ ، ارب پتیوں کی حکومت اور وال سٹریٹ کے بینکاروں کے خلاف عوامی نفرت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ عالمی معاشی گراوٹ نے امریکہ کو اس کی بنیادوں تک ہلا دیا ہے۔ ہر پانچ میں سے ایک بالغ امریکی غربت یا غربت کے دہانے پر زندگی بسر کر رہا ہے۔ عالمی مالیاتی بحران کے آغاز سے تقریباً 5.7 ملین لوگ کم ترین آمدنی کی سطح تک گر گئے ہیں۔

79۔ امریکی حکومت دعویٰ کر رہی ہے کہ بیروزگاری کی سطح 5 فیصد تک گر گئی ہے۔ لیکن اس کی وجہ معاشی نمو نہیں س بلکہ افرادی قوت میں زوال ہے۔ اگر افرادی قوت 2008ء والی ہوتی تو بیروزگاری کی شرح اس وقت 10 فیصد ہوتی۔ مزدوروں کو کم تنخواہ والی ملازمتوں پر گزارہ کرنے پر مجبور کیا جا رہا ہے جہاں انہیں کم سے کم اجرت دی جاتی ہے۔

80۔ یوروزون میں معاشی نمو رک گئی ہے اور بیروزگاری زیادہ ہے۔ جاپان گراوٹ کا شکار ہے اور امریکی معاشی نمو 2 سے 2.5 فیصد کے بیچ رک گئی ہے۔ اب کوئی ایسا ملک نہیں ہے جو ایک نئی معاشی بحالی کے انجن کا کردار ادا کر سکے۔ پچھلے عرصے میں ترقی یافتہ صنعتی ممالک عالمی معیشت کو سہارا دینے کے لیے نام نہاد ابھرتی منڈیوں پر انحصار کرتے رہے ہیں۔ اب مزید کوئی راستہ ہے ہی نہیں۔

81۔ یورپ

82۔ پورے یورپ میں لوگ اس حقیقت کو جان گئے ہیں کہ کٹوتیوں کی پالیسیاں محض عارضی ایڈجسٹمنٹ نہیں بلکہ معیار زندگی پر مستقل حملے ہیں۔ یونان، پرتگال اور آئرلینڈ میں ان پالیسیوں کی وجہ سے پہلے ہی اجرتوں اور پنشنوں میں بڑی کٹوتیاں ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود خسارے کا مسئلہ حل نہیں ہوا ہے۔ یعنی لوگوں کی تمام تر قربانیاں اور محرومیاں رائیگاں چلی گئیں۔

83۔ یورپ کو طویل معاشی سست روی اور تفریط زر کا سامنا ہے۔ ان حالات میں قرضوں کو کم کرنے کی کوشش پہلے سے زیادہ مشکل اور خطرناک ہوگی۔ مجموعی طور پر یوروزون کی معیشت اب تک قبل از بحران 2007ء کی سطح پر نہیں پہنچی ہے۔ معاشی نمو کو بڑھانے والے عوامل: تیل کی کم قیمتیں، یورپی مرکزی بینک کی جانب سے مقداری آسانی (Quantitative Easing) کا پروگرام (جو ماہانہ 60 اَرب یورو ہے) اور برآمدات کو بڑھانے والا کمزور یورو، کے باوجود ایسا نہیں ہوا۔

84۔ تاہم حد سے زیادہ کم افراط زر کی شرح صحت مند معیشت کا اظہار نہیں بلکہ بیماری کی علامت ہے۔ یہ صارفین کی طلب میں کمی کی عکاسی کرتی ہے جو بے تحاشا قرضوں کے اجتماع اور گرتی ہوئی آمدنی کا نتیجہ ہے۔ یہ عمل ایک معاشی تنزلی کو جنم دے سکتا ہے جو مکمل معاشی بحران پر منتج ہوگی۔ نتیجتاً وہ اوور نائٹ شرح سود (Overnight Rate) میں مزید کٹوتی اور مقداری آسانی کے پروگرام میں اضافے کی بات کر رہے ہیں۔

85۔ ان حالات پر بات کرتے ہوئے یورپی مرکزی بینک کے صدر ماریو دراغی نے لکھا ہے، ''آج کے یورو ایریا کو تشکیل دینے والے ممالک کو 1970ء، 1980ء اور 1990ء کی دہائی میں قبل از بحران کی پیداواری سطح پر پہنچنے کے لیے پانچ سے آٹھ کوارٹر (چار مہینے) لگے۔ حالیہ بحران کے دوران، جو بالاتفاق 1930ء کی دہائی کے بعد بدترین بحران تھا، امریکی معیشت کو قبل از بحران کی سطح پر پہنچنے کے لیے 14 کوارٹر لگے۔ اگر ہمارا موجودہ تخمینہ درست ہے تو یورو ایریا کو قبل از بحران کی پیداواری سطح تک پہنچنے کے لیے اکتیس کوارٹر لگیں گے۔''

86۔حتیٰ کہ یہ بھی حد سے زیادہ رجائیت پر مبنی تخمینہ ہے۔ یورپی یونین اپنی موجودہ کمزور کیفیت میں معاشی صدموں کے حوالے سے حساس ہے۔چین کی معاشی سست روی اور ''ابھرتی منڈیوں'' کا بحران سب سے بڑھ کر جرمنی پر خطرناک اثرات مرتب کر رہا ہے جو چین کو مشینیں برآمد کرتا ہے۔ 2014ء میں برآمدات جرمنی کے جی ڈی پی کا 45.6 فیصد تھیں اور یہ ملک یورپ کی معاشی بحالی کے انجن کا کردار ادا کرنے کے قابل اب نہیں رہا ہے۔

87۔شرح نمو جتنی کم ہوگی قرضوں کا بوجھ اتنا ہی زیادہ ہوگا۔یہی یونان کا سبق ہے۔جس طرح دن کے بعد رات آتی ہے،ان حالات میں دیوالیہ پن اور مالیاتی نقصانات ناگزیر ہیں جس سے ایک کے بعد دوسرے ملک میں معاشی انہدام اور دیوالیہ پن کے سلسلے بھی جنم لیں گے۔

88۔معاشی سست روی نے تمام تر تضادات نے کو مزید گہرا کر دیا ہے اور یورپ کی قومی ریاستوں کے درمیان شدید مخاصمت کو ہوا دی ہے۔ پناہ گزینوں کا بحران، اور یہ کہ کون اس کی قیمت ادا کرے گا،ایک عمل انگیز تھا جس نے ان تمام تضادات کو سامنے لا کھڑا کیا۔اس نے جرمنی اور مشرقی یورپی ملک (پولینڈ، ہنگری)، جو کچھ عرصے پہلے تک جرمنی کی نوآبادیات بنے ہوئے تھے، کے درمیان شدید جھگڑوں کو جنم دیا ہے۔

89۔فرانس اور جرمنی بینکنگ یونین کی تجویز پر آپس میں گتھم گتھا ہیں۔فرانس اس پر زور دے رہا ہے جبکہ جرمنی ہچکچاہٹ کا شکار ہے۔ برلن میں موجود خواتین و حضرات فطری طور پر دوسرے ملکوں کے بینکوں کی گارنٹی دینے کے امکانات کے بارے میں زیادہ پرجوش نہیں ہیں۔ان بینکوں کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کوئی اچھی کریڈٹ ریٹنگ کا حامل شخص اپنا کریڈٹ کارڈ اپنے ایسے ہمسائے کو دے دے جو متعدد بار دیوالیہ ہونے کی وجہ سے عدالتوں کے چکر لگا رہا ہو۔

90۔سپراس کی جانب سے سر تسلیم خم کرنے کے باوجود یونان کے بیل آؤٹ کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا۔ یہ اس کے لیے آسان نہیں ہوگا کہ وہ انجیلا مرکل (جرمنی کی چانسلر) اور دوسروں کے کہنے پر شدید کٹوتیاں کرے۔ یونانی محنت کش جب کٹوتیوں اور نجکاری کے خلاف مزاحمت کریں گے تو طبقاتی جدوجہد میں مزید شدت آئے گی۔ایک خاص مقام پر پہنچ کر اس سے حکومت میں بحران آئے گا اور ٹرائیکا (آئی ایم ایف، یورپی کمیشن، یورپی مرکزی بینک) سے ایک نیا جھگڑا

پیدا ہوگا جس سے ایک مرتبہ پھر یونان کی یورو سے بے دخلی اور یوروزون میں بحران کا بھوت منڈلائے گا۔

91۔ برطانیہ میں یورپی یونین کے مسئلے پر ریفرنڈم بھی قریب آ رہا ہے۔ کیمرون قدامت پسند پارٹی کی نمائندگی کرتا ہے جو سختی سے یورپی یونین کے ساتھ مزید جڑت کے خلاف ہے۔ مذاکرات مشکل ہوں گے۔ کیمرون کو یہ دکھانا ہوگا کہ اس نے ٹھوس مراعات حاصل کی ہیں اور مرکل کو یہ دکھانا ہوگا کہ اس نے اسے کچھ بھی نہیں دیا ہے۔

92۔ یورپی یونین کا پھیلاؤ اچانک رک گیا ہے۔ اب یہ اس قابل نہیں رہی کہ مشرقی یورپی ممالک کے نئے ممبران اپنے ساتھ جوڑ سکے۔ یوکرائن کو یورپی یونین کے ساتھ قریبی تعلقات کے سبز باغ دکھانے کے بعد اس بدقسمت ملک کو ڈوبنے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا اور یہ پہلے سے ہی ڈوب رہا ہے۔ اس کے علاوہ یورپی انضمام کا عمل (جو ہماری توقعات سے زیادہ آگے چلا گیا تھا) بارڈر کنٹرول کے نفاذ کے بعد الٹ سمت میں جا رہا ہے۔

93۔ یورپ میں بحران شعور میں تیز تبدیلیاں لا رہا ہے۔ فرانس میں دسمبر 2015ء کے علاقائی انتخابات اس عمل کی نشاندہی کر رہے ہیں۔ پہلے مرحلے میں فرنٹ نیشنل پہلے نمبر پر، سرکوزی کی قدامت پسند جماعت Les Républicains دوسرے اور سوشلسٹ پارٹی تیسرے نمبر پر آئی۔ لیکن اب تک کی سب سے بڑی پارٹی ووٹ نہ ڈالنے والوں کی ہے (50 فیصد سے زیادہ)، جو سیاسی افق پر موجود تمام پارٹیوں سے آبادی کی اکثریت کی بیگانگی کا اظہار ہے۔

94۔ سپین میں 2011ء میں دائیں بازو کی پاپولر پارٹی انتخابات جیت گئی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سوشلسٹ پارٹی کی سابقہ ''بائیں بازو'' کی حکومت نے کٹوتیوں کی پالیسیاں لاگو کیں جس نے عوام کو مایوس کیا اور ناگزیر طور پر پاپولر پارٹی جیت گئی۔ لیکن پوڈیموس کے ابھار کے ساتھ اب ہم ایک الٹ عمل دیکھ رہے ہیں جو اٹھارہ مہینوں میں صفر سے لاکھوں لوگوں کی تحریک میں تبدیل ہوگئی۔

95۔ سپین میں بے چینی اور ریڈیکلائزیشن کا عمل اب بھی جاری ہے۔ سپین میں دسمبر کے

عام انتخابات سے کوئی مسئلہ بھی حل نہیں ہوا۔ PP اپنی اکثریت کھو چکی ہے اور جس کی وجہ سے ایک حکومتی بحران ہے جو لامحالہ نئے انتخابات کی طرف جائے گا۔ پوڈیموس کا ابھار، جس نے اپنی نشستیں صفر سے 69 تک پہنچائی، حکمران طبقے کے لیے تشویش کا باعث بن رہا ہے۔

96۔ پوڈیموس کا تیز ابھار پوری موجودہ سیاسی کیفیت سے گہری بیزاری کا اظہار تھا۔ موجودہ حالات میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ عوام کو تو یہ نہیں پتا کہ انہیں کیا چاہیے لیکن انہیں یہ ضرور پتا ہے کہ انہیں کیا نہیں چاہیے۔ پابلو اگلاسیاس (پوڈیموس کا سربراہ) کی بینکاروں، امیروں اور سیاسی اسٹیبلشمنٹ، جسے وہ ''ٹولہ'' کہتا ہے، پر تنقید درست طور پر عوامی غم و غصے کی عکاسی کرتی ہے۔

97۔ یہ درست ہے کہ پوڈیموس کی قیادت کے نظریات کنفیوز اور غیر واضح ہیں۔ لیکن یہ عوام کی موجودہ شعوری کیفیت سے جڑی ہوئی ہے جو ابھی ابھی سیاسی زندگی میں داخل ہو رہے ہیں اور اس لیے پوڈیموس کم از کم ابتدائی عرصے میں آگے بڑھتی رہی۔ تاہم اگر اسے صحیح نہیں کیا گیا تو یہ تذبذب بالآخر پوڈیموس کو برباد کر دے گا۔ بہت جلد اس پارٹی کو فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ کہاں کھڑی ہے اور کس طرف جانا چاہتی ہے۔

98۔ پرتگال میں شدید آئینی بحران ہے۔ ایک گہری معاشی گراوٹ کی صورت میں یہ تمام عمل مزید تیز ہوگا۔ یورپ کو دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دہائیوں کے حالات کی بجائے 1920ء اور 1930ء کی دہائیوں سے ملتے جلتے حالات کا سامنا ہوگا۔ سماجی اور سیاسی ابھاروں کا دور جس میں دائیں اور بائیں بازو کی طرف شدید رجحانات پیدا ہوں گے۔ لیکن دو عالمی جنگوں کے درمیان کے عرصے کے ساتھ مماثلت کے علاوہ فرق بھی موجود ہیں۔ طبقاتی قوتوں کا باہمی تعلق (Correlation) بالکل مختلف ہے۔

99۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یورپی بورژوازی کو ایک ناقابل حل معمے کا سامنا ہے۔ وہ مجبور ہے کہ پچھلی آدھ صدی میں محنت کش طبقے کی حاصل کردہ مراعات کو ختم کرنے کی کوشش کرے لیکن اسے محنت کشوں کی سخت مزاحمت کا سامنا ہے۔ اسی وجہ سے ہی بحران اتار چڑھاؤ کے ساتھ سالوں تک جاری رہے گا۔

100۔ڈانلڈ ٹسک کی پیش گوئیاں

101۔ یوروزون کے بیروزگاری کے عمومی اعداد وشمار امیر اور غریب ملکوں کے درمیان گہرے فرق کو واضح نہیں کرتا۔ بحران سے پہلے خطے کی بڑی معیشتوں میں بیروزگاری کی شرح بڑی حد تک ایک جیسی تھی۔

102۔2016ء میں یورپی یونین ''مالیاتی استحکام'' کے خوشگوار نام پر کٹوتیوں کی وحشیانہ پالیسیوں میں مزید تیزی لانے کی کوشش کرے گی۔ سرمائے کے سنجیدہ پالیسی ساز ان حالات میں چھپے ہوئے خطرات کو دیکھ سکتے ہیں۔ وہ مارکسسٹوں کے نتائج پر ہی پہنچے ہیں۔15/6/2014 کے فنانشل ٹائمز میں وولفگینگ منچاؤ نے لکھا ہے کہ ''یورپ کو دیوالیے اور سیاسی بغاوتوں کے مستقل خطرات کا سامنا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ بعد از بحران کی تمام تر ایڈجسٹمنٹ اس سے کہیں زیادہ جابر ہوگی جو بیس سال پہلے جاپان میں ہوا تھا۔ ان حالات میں مجھے توقع ہے کہ سیاسی نتائج بہت زیادہ شدید ہوں گے۔ قرضوں میں کمی سے فائدہ ہوگا یہ ابھی واضح نہیں ہے لیکن سیاسی طور پر اس سے فائدہ نہیں ہوگا۔ سیاسی عدم استحکام کو کم کر کے وہ مالیاتی عدم استحکام کو بڑھائیں گے۔''

103۔ حالیہ دنوں میں پولینڈ کے سابق وزیر اعظم ڈانلڈ ٹسک، جو اب یورپین کونسل کا سربراہ ہے، نے کہا ہے کہ اسے ڈر ہے کہ یونان کا بحران مالیاتی اثرات سے زیادہ ''سیاسی وبا'' کا حامل ہوگا:

104۔ اس نے کہا ''میں یونان کے بحران کی مالیاتی وبا سے نہیں بلکہ نظریاتی یا سیاسی وبا سے بہت خوف زدہ ہوں۔ ہماری یورپی تاریخ میں بڑے سانحات سے پہلے ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے۔ تمام اطراف کے ریڈیکل عناصر کے درمیان تدبیری اتحاد۔ یقیناً آج بھی ہم یہی سیاسی مظہر دیکھتے ہیں۔''

105۔ یہ وہی ٹسک ہے جس نے انجلا مرکل کے ساتھ مل کر الیکسس سپراس کو سخت شرائط کی حامل وسیع کٹوتیاں ماننے پر مجبور کیا تھا جن میں یونان کے 50 بلین یورو کے قومی اثاثوں کی نجکاری، پنشن میں کٹوتی، ٹیکسوں میں اضافہ اور دیگر گہری کٹوتیاں شامل تھیں۔ ٹسک نے بعد میں

احتجاج کیا کہ وہ اس دلیل کو نہیں مانتا کہ ''یونان یا سپراس کو سزا دی گئی ہے۔ یہ تمام تر کام یونان کی مدد کے لیے تھا۔''

106۔ لیکن ٹسک نے یہ بھی کہا کہ وہ انتہائی بائیں بازو کے بارے میں پریشان ہے جو اس کے مطابق ''بائیں بازو کی اس ریڈیکل غلط فہمی کی وکالت کر رہے ہیں کہ آپ موجودہ یورپی یونین کے معاشی ماڈل کا متبادل تعمیر کر سکتے ہیں''۔ اس نے کہا کہ بائیں بازو کے یہ انتہا پسند لیڈر روایتی یورپی اقدار جیسے ''کفایت شعاری'' اور لبرل، منڈی پر مبنی اصولوں، جو یورپی یونین کے لیے کارآمد رہے ہیں، کو رد کر رہے ہیں۔

107۔ دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح بیروزگاری کی مسلسل بلند سطح کی وجہ سے نوجوان خاص طور پر زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ اس وقت خطے کی سب سے بڑی معیشت جرمنی میں نوجوانوں میں بیروزگاری کی شرح 7.1 فیصد ہے۔ اٹلی میں پچیس سال سے کم عمر کے 40 فیصد لوگ بیروزگار ہیں۔ فرانس یہ 24 فیصد اور برطانیہ میں 17 فیصد ہے۔ لیکن سپین اور یونان میں یہ 45 فیصد ہے۔

108۔ حکمران طبقے کو خوب پتا ہے کہ ان کے نظام کے لیے یہ کتنا خطرناک ہے۔ لندن بزنس سکول کی محترمہ ریکلن نے کہا ''اٹلی میں نوجوانوں کی بڑی تعداد ایسی ہے جو مکمل تباہی کے دہانے پر ہیں اور جو وقت کے ساتھ سیاسی دباؤ پیدا کریں گے۔ اٹلی کی اپوزیشن فی الحال منقسم ہے لیکن لازمی نہیں ہے کہ ہمیشہ ایسا رہے۔''

109۔ سپراس کا حوالہ دیتے ہوئے ڈالڈ ٹسک نے کہا کہ انتہائی بائیں بازو کے راہنماؤں کی جذباتی تقریریں اور متعدد ملکوں میں بلند سطح کی نوجوانوں کی بیروزگاری ایک خطرناک امتزاجہے۔ ''میری نظر میں حالات 1968ء کے بعد کے یورپ سے مماثلت رکھتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ایک انقلابی کیفیت تو نہیں لیکن ایک عمومی اضطراب موجود ہے۔ جب اضطراب ایک انفرادی نہیں بلکہ سماجی احساس بن جائے تو یہ انقلابات کا آغاز ہوتا ہے۔''

110۔ یونان کے بحران کے اثرات یونان سے باہر دور تک محسوس کیے گئے ہیں۔ یورپی اتحاد کی باتیں ہوا ہو گئی ہیں۔ مذاکرات کے دوران جرمنی آمرانہ انداز میں آرکیسٹرا کے ایک کنڈکٹر

کی طرح تھا۔ مرکل نے واضح طور پر دکھایا کہ وہ مختارِ کل ہیفرانسیسی بورژوازی، جسے ایک عرصے تک یہ غلط فہمی تھی کہ وہ یورپ کے مشترکہ حاکم ہیں، نے اپنے تحفظات پر زیادہ زور دینے سے گریز کیا۔ بحران کے گہرے ہونے سے یہ تضادات مزید تیز ہوں گے۔

111۔ لاکھوں لوگوں کے سامنے بورژوا جمہوریت کا دھوکہ بے نقاب ہوگیا ہے۔ مرکل نہایت واضح زبان میں کہہ رہی تھی: عوامی ریفرنڈم اور انتخابات کی کوئی وقعت نہیں ہے؛ یورپ کی بڑی طاقتیں اور حقیقی حکمران یعنی بینکار اور سرمایہ دار، اکثریت کی رائے سے قطع نظر تمام تر فیصلے کریں گے۔ اسی طرح سپراس کی شرمناک پسپائی نے اصلاح پسندی اور سوشل ڈیموکریسی کی حدود کو واضح کر دیا ہے۔

112۔ یہ جنگوں، انقلابات اور رد انقلابات کا دور ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے، جیسا کہ جاہل فرقہ پرستوں کا خیال ہے، فاشزم یا بونا پارٹزم کا خطرہ آنے والا ہے۔ یقیناً طویل مدت میں اگر محنت کش طبقہ نجات کا کوئی راستہ سماج کو پیش نہیں کرتا تو حکمران طبقہ رجعت کی طرف جانے کی کوشش کرے گا۔ لیکن طبقاتی قوتوں کے تبدیل شدہ باہمی تعلق کی وجہ سے ایسی صورتحال ماضی کے فاشزم کی شکل اختیار نہیں کر سکتی بلکہ بونا پارٹسٹ طرز حکومت کی کوئی شکل اختیار کر سکتی ہے۔ اُس صورت میں بھی ایک خانہ جنگی کے خطرے کو ابھارے بغیر، جسے وہ جیتنے کے بارے میں پر اعتماد نہیں ہیں، وہ فوری طور پر کوئی فوجی آمریت نافذ نہیں کر سکتے۔

113۔ جلد یا بدیر حکمران طبقہ اس فیصلے پر پہنچے گا کہ جمہوریت ایک عیاشی ہے جسے وہ مزید برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن پہلے وہ احتیاط کے ساتھ ایک ایک کر کے بتدریج جمہوری حقوق کو ختم کریں گے اور پارلیمانی بونا پارٹزم کی طرف جائیں گے۔ لیکن سرمایہ دارانہ بحران کی کیفیت میں ایک رجعتی بونا پارٹسٹ حکومت غیر مستحکم ہوگی۔ یہ کوئی مسئلہ حل نہیں کر سکے گی اور زیادہ عرصہ نہیں چلے گی۔ اس سے وسیع تر انقلابی ابھار کے لیے ہی راستہ ہموار ہوگا جیسا کہ 74-1967ء کے دوران یونان کی فوجی حکومت کے خلاف انقلاب ابھرا تھا۔ ہمیں اس طرح کی تمام تر تبدیلیوں کے لیے تیار رہنا ہوگا تا کہ واقعات ہمیں حیران نہ کر دیں۔

114۔ برطانیہ

115۔ جیرمی کوربین کے بھاری اکثریت سے لیبر پارٹی کے لیڈر کے انتخاب نے راتوں رات برطانیہ کی صورت حال کو تبدیل کر دیا۔ اس تبدیلی کی پیش بینی سکاٹ لینڈ میں ہونے والے واقعات سے ہوگئی تھی جہاں اسٹیبلشمنٹ کے خلاف بغاوت کا اظہار ایس این پی کی تیز بڑھوتری میں ہوا تھا۔ یہ دائیں بازو کی نہیں بلکہ بائیں بازو کی تحریک تھی۔ یہ قوم پرستی کا اظہار نہیں تھا بلکہ ویسٹ منسٹر (برطانوی حکومت کا مرکز) میں بیٹھے ہوئے کمزور حاکم ٹولے کے خلاف شدید نفرت کا اظہار تھا۔ لیبر پارٹی کی قیادت کی بردلانہ طبقاتی مصالحت کی پالیسیوں کی وجہ سے انہیں اسٹیبلشمنٹ کے حصے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

116۔ کوربین کا انتخاب اپنے اندر حادثات کے ایک سلسلے کی پیداوار تھا۔ لیکن ہیگل نے واضح کیا تھا کہ ضرورت اپنا اظہار حادثات کی صورت میں کرتی ہے۔ کوربین کا قیادت کی دوڑ میں اپنا نام شامل کرانا حادثے کے فلسفیانہ زمرے میں آتا ہے یعنی ایک ایسی چیز جو ہو بھی سکتی تھی اور نہیں بھی۔ لیکن جب یہ ہوا تو اس نے پوری کیفیت کو تبدیل کر دیا۔

117۔ ٹیلی وژن میں اپنی پہلی بحث میں ہی وہ واضح طور پر دوسرے امیدواروں سے مختلف تھا۔ وہ ایک مختلف، تازہ، زیادہ ایماندار، ریڈیکل اور لاکھوں لوگوں، جو سٹیٹس کو سے بیزار ہو چکے تھے اور اسٹیبلشمنٹ سے اپنی بیزاری کا اظہار کرنا چاہتے تھے، کی آرزوؤں سے ہم آہنگ بات کر رہا تھا۔

118۔ عام انتخابات سے پہلے لیبر پارٹی میں کوئی جان نہیں تھی۔ لیکن کوربین کی مہم نے صورت حال کو تبدیل کر دیا۔ یہی وہ عمل انگیز تھا جو سماج کے تمام تر اضطراب کا نقطہ اجتماع بن گیا جسے اب تک کہیں پر، اور دائیں بازو سے مغلوب لیبر پارٹی میں تو بالکل بھی اظہار کوئی ذریعہ نہیں ملا تھا۔

119۔ جیرمی کوربین کے انتخاب نے وہ واحد چیز فراہم کر دی جس کی اب تک برطانیہ میں کمی تھی: عوام کے مجتمع شدہ اضطراب اور غم و غصہ کا اظہار۔ یہ لیبر پارٹی کے احیا اور اسے بائیں

طرف دھکیلنے کا آغاز کر رہا ہے۔ یہ حکمران طبقے کے لیے ایک جان لیوا خطرہ ہے اور وہ اسے تباہ کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑیں گے۔

120۔ دہائیوں تک لیبر پارٹی دائیں بازو کی قیادت کے تحت موجودہ نظام کی حمایت کا ستون تھا۔ حکمران طبقہ ایک سخت جدوجہد کے بغیر اسے ترک نہیں کرے گا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے دفاع کی پہلی صف پارلیمانی لیبر پارٹی ہے۔ اس جدوجہد میں پارلیمانی لیبر پارٹی کی بلیرائٹ اکثریت براہ راست اور دانستہ طور پر بینکاروں اور سرمایہ داروں کی ایجنٹ ہے۔ یہی ان کے متعصّبانہ ارادوں کی وضاحت کرتا ہے کہ ہر قیمت پر جیرمی کوربین سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ لیبر پارٹی میں ایک سپلٹ کے لیے راہ ہموار ہو رہی ہے جو برطانیہ میں ایک بالکل نئی صورت حال کو جنم دے گی۔

121۔ نہ صرف لیبر پارٹی بلکہ ٹوری پارٹی بھی، بالخصوص یورپی یونین کے مسئلے پر، منقسم ہے۔ برطانیہ کے ریفرنڈم کے نتائج کی پیش گوئی کرنا مشکل ہے لیکن برطانیہ کا یورپی یونین سے انخلا یورپ اور برطانیہ دونوں کے لیے شدید اثرات کا حامل ہوگا۔ یہ ٹوٹ پھوٹ کے عمل کو تیز کر دے گا جو بالآخر یورپی یونین کی تباہی پر منتج ہوگی۔ دوسری طرف اگر برطانیہ یورپی یونین کو چھوڑ دیتا ہے تو سکاٹش قوم پرست، جو یورپی یونین کے حامی ہیں، آزادی کے لیے ایک اور ریفرنڈم کا مطالبہ کریں گے جو متحدہ برطانوی ریاست کی تقسیم پر منتج ہوگا۔

122۔ ٹوری پارٹی میں دراڑیں مزید گہری ہوں گی، ممکنات ہیں کہ یورپی یونین مخالف دایاں بازو تقسیم ہو کر یورپی یونین مخالف اور مہاجرین مخالف یو کے آئی پی (UKIP) میں ضم ہو کر قدامت پسندوں کے دائیں جانب ایک بونا پارٹسٹ شاہ پرست پارٹی بنائیں گے۔ دوسری انتہا پر، بلیرائٹ دایاں بازو واضح طور پر لیبر پارٹی سے الگ ہونے کی طرف جا رہا ہے۔ اگرچہ وہ اور بورژوازی دونوں اس طرح کی حرکت کے نتائج سے خوف زدہ ہیں، تاہم ممکن ہے کہ ایک خاص مقام پر لیبر پارٹی کا دایاں بازو مجبور ہو کر الگ ہو جائے اور قدامت پسند ''بائیں بازو'' اور لبرل ڈیموکریٹس کے ساتھ مل کر کسی قسم کی قومی حکومت تشکیل دے۔

123۔ بظاہر برطانوی حکمران طبقے کے پاس یہی واحد راستہ ہے جس کے ذریعے وہ

کوربین کی لیبر حکومت کے بننے کو روک سکتے ہیں۔لیکن یہ بہت خطرناک حکمت عملی ہے۔اس سے طبقاتی کی شدید صف آرائی ہوگی اور لیبر پارٹی مزید بائیں جانب جھکے گی۔گہرے بحران کے وقت اپوزیشن میں لیبر پارٹی دوبارہ مضبوط ہوگی اور بائیں بازو کی لیبر حکومت کے لیے راستہ ہموار ہوگا۔جرنیلوں نے پہلے سے ہی کوربین کے اقتدار میں آنے کی صورت میں فوجی بغاوت کی دھمکی دی ہے۔اس سے فوری طور طبقاتی جنگ چھڑ جائے گی اور برطانیہ میں ایک انقلابی بحران پیدا ہوگا۔

124۔لیبر پارٹی میں اب بحران اور سپلٹ کا تناظر بنتا ہے جو مارکسی رجحان کے لیے وسیع تر مواقع فراہم کرے گی۔لیکن ہماری ترجیح اب بھی نوجوانوں کو جیتنا اور ان کی تربیت کرنا ہے۔اس سے ہمیں وہ کیڈرز مہیا ہوں گے جن کی ہمیں مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضرورت ہوگی۔یہ معمول کا بحران نہیں ہے۔حالات میں تیز اور اچانک تبدیلیاں مضمر ہیں۔ہمیں غیر متوقع کی توقع کرنی چاہیے۔شاید حکمت عملی کو چوبیس گھنٹے کے اندر تبدیل کرنا پڑ جائے۔

125۔یہ تمام تر واقعات سماج کی کوکھ میں ہونے والی گہری تبدیلیوں کی عکاسی کرتے ہیں۔اس کو ٹراٹسکی نے بہت اچھے طریقے سے سوشلسٹ انقلاب کا سالماتی عمل قرار دیا تھا یعنی ایک ایسا عمل جس میں چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں بتدریج جمع ہوتی ہیں اور پھر وہ نازک موڑ آتا ہے جب مقدار معیار میں تبدیلی ہو جاتی ہے۔

126۔بورژوازی کی غلط فہمیاں

127۔سوویت یونین کے انہدام اور سرد جنگ کے خاتمے کے ساتھ ہی یورپی بورژوازی کے سامنے مستقل معاشی خوشحالی اور روز افزوں یورپی انضمام (جرمن کنٹرول کے تحت)، جو یورال تک یورپ کی سرحد کو پھیلائے گا، کے درخشاں امکانات کھلے تھے۔جاہ و جلال کے ان خوابوں سے مدہوش ہو کر یورپی بورژوازی نے چند انتہائی حساس شعبوں میں بڑی حد تک قومی خودمختاری کو ترک کر دیا۔یوروزون کی تخلیق غالباً اس امر کی سب سے واضح مثال ہے۔

128۔مارکسسٹوں نے نشاندہی کی تھی کہ سیاسی یونین کے بغیر مالیاتی یونین ناممکن ہے۔

ہم نے پیش گوئی کی تھی کہ یورو اس وقت تک قائم رہ سکے گا جب تک معاشی حالات سازگار رہوں گے لیکن معاشی گراوٹ کی صورت میں تمام تر قومی تضادات سر اٹھائیں گے اور باہمی الزام تراشی کی کیفیت میں یورو منہدم ہو جائے گا۔ پچیس سال بعد آج یہ پیش گوئی اپنی پوری آب و تاب برقرار رکھے ہوئے ہے۔

129۔ مارکسسٹ غیر مبہم انداز میں تمام تر سرحدوں کے خاتمے اور یورپی اتحاد کے حق میں ہیں۔ لیکن سرمایہ دارانہ بنیادوں پر یہ ایک رجعتی یوٹوپیا ہے۔ یونان کے ساتھ برسلز اور برلن کا بے رحمانہ سلوک اس کے رجعتی پہلو کو عیاں کرتا ہے۔ بینکاروں اور سرمایہ داروں کے تسلط میں یورپی یونین مستقل کٹوتیوں کی پالیسیوں پر عمل پیرا ہے۔ افسروں کا ایک غیر منتخب اور غیر ذمہ دار ٹولہ پالیسیاں لاگو کرتا ہے اور منتخب حکومتوں، جیسا کہ یونان میں سائیریزا کی حکومت، کے فیصلوں کو روندتا ہے۔

130۔ نیٹو اور امریکی سامراج کے ساتھ اتحاد میں یورپی یونین عالمی سطح پر بھی ایک رجعتی کردار ادا کر رہا ہے۔ اس نے بلقان میں مداخلت کی جہاں یوگوسلاویہ کی تقسیم کے جرم میں اس کا اہم کردار تھا۔ اس نے چیکوسلواکیہ کی تقسیم، جس کے بارے میں نہ تو چیک اور نہ سلوا کی لوگوں سے کوئی مشورہ کیا گیا، کی سازش کی۔ امریکی سامراج کے ساتھ ملک کر یوکرائن میں اس کی مداخلت نے موجودہ تباہ کن صورت حال کو جنم دیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ سب کچھ جرمن سامراج کے مفادات کے لیے تھا جو یورپی یونین کا حقیقی حاکم ہے اور جو بلقان اور مشرقی یورپ پر اپنا سکہ دوبارہ جمانے کی کوشش کر رہا ہے۔

131۔ یورپ کی دیگر سامراجی طاقتوں، بالخصوص برطانیہ اور فرانس، کا کردار اب جرمنی کے نائب پارٹنر کا رہ گیا ہے۔ لیکن افریقہ، مشرق وسطیٰ اور کیریبین میں ان کے اپنے سامراجی مفادات ہیں جسے وہ یورپی یونین کے جھنڈے تلے آگے بڑھا رہے ہیں۔ لیبیا پر بمباری میں فرانس اور برطانیہ پیش پیش تھے۔ عراق پر مجرمانہ حملے میں برطانیہ امریکہ کا سب سے پرجوش اتحادی تھا۔ اب شام میں یہی کردار فرانس ادا کر رہا ہے۔ ہر کوئی انسانیت کے نام پر اپنا الو سیدھا کر رہا ہے۔

132۔ یورو کے ساتھ شینجن معاہدہ بھی یورپی یونین کی بنیاد ہے۔اس سے پورے یورپ میں اجناس کی نقل وحرکت میں وقت اور خرچ کی بچت ہوئی ہے کیونکہ اب ٹرکوں کو مزید گھنٹوں تک عالمی سرحدوں پر انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔اس سے سیاحوں اور سرحدی قصبوں میں رہنے والوں کو فائدہ ہے کیونکہ پاسپورٹ اور ویزوں کی اب ضرورت نہیں رہی۔ بے معنی سرحدوں کیپیٹر ولنگ پر خواہ مخواہ خرچ ہونے والی رقم بچ جاتی ہے۔اس معاہدے کو ایک وفاقی یورپ کے قیام میں اہم قدم ثابت ہونا تھا۔

133۔ 1995ء میں شینجن معاہدے پر دستخط کرنے والے ممالک کے درمیان بارڈر کنٹرول کا خاتمہ ہوگیا اور چھبیس ممالک کے لیے مشترکہ ویزا پالیسی بنائی گئی۔لیکن اب وسیع تر یورپی انضمام کا عمل اپنے الٹ میں تبدیل ہوگیا ہے۔یورپی یونین کے بحران کو مہاجرین کے مسئلے نے بالکل بے نقاب کردیا ہے۔

134۔ یورپ اور مہاجرین کا بحران

135۔نومبر 2015ء میں پیرس میں ہونے والے قتل عام سے بالآخر مشرق وسطیٰ یورپ پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ جنگوں، بھوک اور جبر کی وحشت سے بھاگتے ہوئے ہزاروں مہاجرین کی آمد نے یورپ کی حکومتوں کے لیے ایک معمہ کھڑا کردیا۔درحقیقت صرف مشرق وسطیٰ میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں مہاجرین کا ایک بحران ہے۔ عالمی سطح پر 2014ء کے اواخر میں جنگوں، اقلیتوں پر جبر اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں سے 60 ملین لوگ اپنے علاقوں سے بے دخل ہوئے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام کے عالمی بحران کی واضح عکاسی ہے، یعنی بنیادی انسانی حقوق اور زندہ رہنے کے حق کی فراہمی میں ناکامی۔شام، افغانستان اور دنیا کے دوسرے جنگ و غربت زدہ حصوں سے مہاجرین کی آمد کی وجہ سے سخت بارڈر کنٹرول کا مطالبہ سامنے آیا ہے۔

136۔انجلا مرکل نے فوراً اپنی باہیں دروازے پر کھڑے مہاجرین کے لیے کھول لیں۔ بلاشبہ کسی حد تک یہ ہمدردی کے ان جذبات کو اپنے مفاد میں استعمال کرنے کی کوشش تھی جو جرمنی اور دیگر یورپی ممالک کے عوام نے ظاہر کئے تھے۔عام لوگ، جن کے خیالات اور افعال کی بنیاد

بینکاروں اور سرمایہ داروں کی طرح بے رحم حساب کتاب پر نہیں ہے، وہ غریب اور ستم زدہ لوگوں کی طرف ہمیشہ ہمدردی اور یک جہتی کا اظہار کرتے ہیں۔ دوسری طرف سرمایہ دار طبقہ سرحدیں کھلی رکھنے کی پالیسی کے حق میں تھا، لوگوں کی اذیتوں سے ہمدردی کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے کہ انہیں انتہائی کم قیمت پر انسانی محنت بڑی مقدار میں حاصل ہو جائے۔

137۔ تاہم مرکل کی رحم دلی زیادہ عرصہ نہیں چلی۔ جرمنی کو 2015ء میں دس لاکھ سے زائد پناہ گزینوں کی آمد کی توقع تھی لیکن جرمنی میں مہاجرین کے ٹھکانوں پر حملے بڑھ رہے ہیں اور Alternativ für Deutschland جیسی مہاجرین مخالف دائیں بازو کی پارٹیوں کے ووٹ بڑھ رہے ہیں۔ اب مرکل ترکی سے درخواست کر رہی ہے کہ نہ صرف مہاجرین کی آمد کو روکے بلکہ انہیں واپس بھیج دے۔ برلن یہ مطالبہ کر رہا ہے کہ پوری یورپی یونین میں مہاجرین کو برابر تقسیم کیا جائے۔ اس تجویز کے بارے میں لندن اور پیرس کسی طرح بھی پرجوش نہیں ہیں اور وارسا اور بڈاپسٹ (یعنی پولینڈ اور ہنگری) نے تو یکسر مسترد کر دیا ہے۔

138۔ یورپی یونین کے ممبران کے درمیان شدید تضادات جنم لے چکے ہیں۔ فرانسیسی اور آسٹریائی حکام نے اٹلی پر الزام عائد کیا ہے کہ وہ مہاجرین کو اٹلی سے دوسرے ممالک جانے دے رہے ہیں (حتیٰ کہ حوصلہ افزائی کر رہے ہیں) اور انہوں نے اٹلی کے ساتھ سرحد بند کرنے کی دھمکی دی ہے۔ فرانس نے اپنی دھمکیوں پر عمل کیا اور جون کے اواخر میں مختصر عرصے کے لیے اپنی سرحد بند کر دی۔ یورپ کا سب سے امیر ملک جرمنی مہاجرین کی بڑی تعداد کو جذب کر سکتا تھا۔ دیگر ممالک میں یہ صلاحیت نہیں۔ یونان اور اٹلی نے دوسروں کی نسبت مہاجرین کی وسیع تعداد کو جذب کیا ہے۔ انہوں نے بار بار زیادہ وسائل اور یورپی یونین میں مہاجرین کے کوٹے کو متعارف کرنے کا مطالبہ کیا ہے۔ لیکن ان باتوں پر کوئی بھی کان نہیں دھرتا۔ مرکزی اور مشرقی یورپی ملکوں نے فوری طور پر کوٹہ کی تجویز کو مسترد کر دیا۔

139۔ اب مسئلہ یہ ہے کہ شینجن معاہدے کا کیا بنے گا جو ممبر ریاستوں کے درمیان مہاجرین کی آزادانہ نقل و حرکت کی بات کرتا ہے۔ حتیٰ کہ پیرس کے واقعات سے پہلے ہی یورپی کونسل کے پولش صدر ڈانلڈ ٹسک نے کہا تھا، ''ہمیں کسی طرح کے شبے میں نہیں ہونا چاہیے۔ شینجن

کا مستقبل خطرے میں ہے اور وقت گزرتا جا رہا ہے۔ ہمیں اپنی بیرونی سرحدوں کا کنٹرول دوبارہ حاصل کرنا چاہیے۔'' پیرس کے حملوں نے حکومتوں (نہ صرف فرانس بلکہ دوسری ریاستیں بشمول جرمنی اور سویڈن) کو اچھا بہانہ فراہم کیا کہ وہ ''عارضی'' بارڈر کنٹرول متعارف کریں۔

140۔ پورے یورپ میں یورپی یونین کے خلاف روز افزوں بیزاری اور بداعتمادی اور غم و غصہ موجود ہے۔ یونان کے ساتھ ظالمانہ سلوک کے بعد کٹوتی (آسٹیریٹی) مخالف جنوبی یورپی ملکوں میں برسلز کے خلاف ایک روز افزوں سیاسی مخالفت موجود ہے۔ دوسری انتہا پر جرمنی، فرانس، فن لینڈ، ڈنمارک اور شمالی یورپ کے دیگر ممالک میں دائیں بازو کی پناہ گزین مخالف پارٹیوں کی جانب سے مخالفت بڑھ رہی ہے۔

141۔ جتنا زیادہ عرصہ ریاستیں بارڈر کنٹرول جاری رکھیں گی، ایک کھلے یورپ کا اصول اتنا ہی کمزور ہوگا۔ جرمنی، فرانس، فن لینڈ، ڈنمارک، سویڈن اور ہنگری میں قوم پرست اور مہاجرین مخالف پارٹیوں کا ابھار یورپی حکومتوں پر سرحدوں کو بند کرنے کے لیے مزید دباؤ ڈال رہا ہے۔ واضح طور پر شینجن معاہدے کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ اگر اس کو مکمل طور پر ختم نہ بھی کیا گیا تو اس میں یقیناً اس طرح ترمیم کی جائے گی کہ یورپ میں آزادانہ نقل و حرکت کے ''مقدس اصول'' کی روح ختم ہو جائے گی۔

142۔ ممبر ریاستیں بارڈر کنٹرول دوبارہ متعارف کرنے کے مسئلے پر زیادہ اختیارات اور طاقت کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ شینجن معاہدے میں ترمیم ہونے یا نہ ہونے کی صورت میں ٹرینوں، بس سٹیشنوں اسور ایئر پورٹس پر سخت تر پولیس نگرانی ہوگی۔ یہ پہلے سے ہی ہو رہا ہے۔ امیگریشن قوانین کو مزید سخت کیا جائے گا تاکہ مہاجرین کے لیے فلاحی وظیفے حاصل کرنا مزید مشکل ہو جائیں۔ رومانیہ اور بلغاریہ جیسے ممالک، جو ابھی شینجن معاہدے کا حصہ نہیں ہیں، سخت کنٹرول لاگو کریں گے۔ پولینڈ اور ہنگری، جو جرمن سامراج کی دم چھلا ریاستیں تھیں، اب مہاجرین کے مسئلے پر برلن سے براہ راست متصادم ہیں۔

143۔ شینجن معاہدے کے کمزور ہونے سے لامحالہ لوگوں کی آزادانہ نقل و حرکت، جو یورپی یونین کے بنیادی ستونوں میں سے ایک ہے، متاثر ہوگی۔ ایک دفعہ جب کوئی بنیادی اصول کمزور

ہو جائے تو دوسری چیزیں بھی اسی طرح متاثر ہوں گی۔ لوگوں کی آزادانہ نقل و حرکت کو محدود یا ختم کرنے سے اجناس کی نقل و حرکت کو محدود کرنے کا راستہ ہموار ہوگا۔ اس کے ساتھ یورو کا انہدام، جو مکمل طور پر ممکن ہے، آج کے یورپی یونین کے خاتمے کا پیش خیمہ ہوگا۔ یورپی اتحاد کا خواب چکنا چور ہو جائے گا۔

144۔ سرمایہ داری کے تحت سرحدوں کے بغیر براعظم کا تصور ایک ناقابل حصول خواب ہی رہے گا۔ یورپ کا اتحاد، جو تاریخی طور پر ضروری اور ترقی پسند فریضہ ہے، صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب یورپ کے محنت کش بینکوں اور اجارہ داریوں کی آمریت کو اکھاڑ پھینکیں اور سوشلسٹ ریاستہائے متحدہ یورپ کی بنیاد پر عوام کی آزادانہ اور رضاکارانہ یونین کی بنیاد رکھیں۔

145۔ عالمی تعلقات

146۔ عالمی تعلقات کی رو سے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ ماضی میں ہمیشہ کم از کم تین یا چار عالمی طاقتیں ہوتی تھیں جو یورپی یا عالمی سطح پر بالادستی کے لیے مقابلہ کرتی تھیں۔ اس لیے طویل عرصے تک عالمی تعلقات کسی حد تک توازن کی کیفیت میں ہوتے تھے جس میں وقفے وقفے سے جنگیں رخنہ ڈالتی تھیں۔

147۔ معاشی عدم استحکام کا اظہار بڑھتے ہوئے سیاسی عدم استحکام میں ہوتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد حالات کبھی بھی اتنے پرتناؤ نہیں تھے۔ سوویت یونین کے انہدام کے بعد امریکی سامراج کے جارحانہ پھیلاؤ کے رجحانات نے ہر طرف (بلقان، مشرق وسطیٰ، وسطی ایشیا، شمالی افریقہ، پاکستان اور حالیہ دنوں میں افریقہ) پُر انتشار صورت حال پیدا کی ہے۔

148۔ دوسری جنگ عظیم سے پہلے ہی لیون ٹراٹسکی نے پیش گوئی کی تھی کہ امریکہ عالمی طور پر ایک غالب طاقت کے طور پر ابھرے گا لیکن اس نے یہ اضافہ کیا تھا کہ اس کی بنیادوں میں بارود بھرا ہوگا۔ گیارہ ستمبر کو جڑواں ٹاورز کی تباہی نے اس پیش گوئی کو ڈرامائی انداز میں صحیح ثابت کر دیا۔

149۔ امریکہ نے 1945ء میں اپنے آپ کو ایک عالمی طاقت کے طور پر منوالیا۔ امریکی طاقت کے ابھار کے ساتھ یورپی سامراجی ریاستوں کا زوال ہوا۔ دوسری عالمی جنگ نے جاپان

اور مغربی یورپ کو برباد کر دیا۔ امریکی سامراج معاشی، عسکری اور سیاسی طور پر غالب تھا، اگرچہ اسے سوویت یونین کی طاقت کا سامنا تھا۔

150۔ ایک غیر مستحکم مشترکہ حاکمیت قائم ہوئی جو تقریباً نصف صدی تک چلی۔ طاقت کا مرکز لندن، پیرس یا وارسا نہیں بلکہ واشنگٹن اور ماسکو تھا۔ اس وقت امریکہ عراق، شام یا یوگوسلاویہ جیسے ملکوں، جو سوویت یونین کے حلقہ اثر میں تھے، میں بھی مداخلت نہیں کر سکتا تھا کجا کہ وہ یوکرائن یا جارجیا میں مداخلت کرتا جو اس وقت سوویت یونین کا حصہ تھے۔

151۔ دو دہائیاں پہلے سوویت یونین کے انہدام کے ساتھ ہی یہ سب تبدیل ہو گیا۔ اندرونی بحرانات اور وسیع احتجاجی تحریک کے دباؤ میں آ کر ماسکو کو مشرقی یورپ سے نکلنا پڑا۔ سوویت یونین کی سربراہی میں بننے والے وارسا پیکٹ (جو نیٹو کے جواب میں سوویت یونین اور اس کے اتحادیوں نے بنایا تھا) کا خاتمہ ہو گیا۔ تاہم نیٹو روس کے لیے ایک ممکنہ خطرے کے طور پر موجود رہا۔

152۔ 1980ء کی دہائی میں امریکی صدر رانلڈ ریگن نے اس وقت کے سوویت رہنما میخائل گورباچوف سے زبانی وعدہ کیا تھا کہ مغرب کا کوئی ارادہ نہیں کہ نیٹو کو مشرق کی طرف سوویت یونین کے حلقہ اثر تک پھیلائے۔ یہ جھوٹ تھا۔ پچھلی دو دہائیوں میں امریکہ نے منظم طریقے سے نیٹو کو مشرق کی طرف پھیلایا ہے اور اس میں متعدد ریاستوں کو شامل کیا ہے جو پہلے سوویت یونین کے حلقہ اثر میں تھیں۔

153۔ یوگوسلاویہ کو تقسیم کرنے کے پیچھے امریکی اور جرمن سامراج کا ہاتھ تھا۔ یوگوسلاویہ کے لوگوں کے لیے یہ ایک رجعتی عمل اور روس کے لیے ایک مکمل ہزیمت تھی۔ اگرچہ روس کی فوجیں وہاں موجود تھیں لیکن مغرب کو وہاں غلبہ پانے دیا گیا جبکہ روسی فوج کا کردار ایک بے بس تماش بین کا رہا۔

154۔ ماضی میں عالمی سطح پر اس طرح کے تضادات عالمی جنگ کا باعث بن سکتے تھے۔ لیکن اب یہ مزید ممکن نہیں رہا۔ عالمی سطح پر طاقتوں کا توازن اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ امن کا دور دورہ ہے۔ اس کے برعکس تضادات اپنا اظہار ناختم ہونے والی

چھوٹی جنگوں میں کریں گے جو خوفناک خون ریزی اور انتشار کو جنم دیں گی۔

155۔ اگرچہ امریکہ اب بھی بہت طاقتور ہے لیکن مختار کل بالکل نہیں ہے۔ عراق اور افغانستان کی جنگوں نے امریکی سامراج کی طاقت کی محدودیت کو واضح کر دیا ہے۔ حتیٰ کہ طاقتور ترین سامراجی ریاست بھی پوری دنیا میں بے شمار جنگوں میں اپنے آپ کو الجھا نہیں سکتی۔ ایسے میں جلد ہی وہ معاشی اور سیاسی طور پر تھک جائے گی کیونکہ عوامی رائے تیزی سے بیرونی مداخلتوں کے خلاف ہو جائے گی۔ جارج ڈبلیو بش کی قیادت میں کند ذہن حکمران ٹولے نے اس سبق کو بھلا دیا تھا۔ اس کے جانشینوں کو یہ سبق دردناک طریقے سے دوبارہ سیکھنا پڑا۔

156۔ روس اور امریکہ

157۔ امریکی سامراج کے اصرار پر نیٹو روس کی سرحدوں تک آگے بڑھتا چلا گیا۔ پہلے بلقان کی ریاستوں کو نیٹو میں شامل کیا گیا پھر پولینڈ شامل ہو گیا۔ لیکن جب امریکہ نے جارجیا کو نیٹو میں شامل کرنے کی کوشش کی تو اس نے اپنی چادر سے بڑھ کر پاؤں پھیلائے۔ روس نے فوج بھیج کر جارجیا کو برق رفتاری سے شکست دے دی۔ اب بے عزتی کی باری امریکہ کی تھی کیونکہ روس نے واشنگٹن کی طرف سے جارجیا کے حکمران ٹولے کو دیئے گئے اسلحے اور آلات کی بڑی مقدار، حتیٰ کہ باتھ روم سے فلش بھی ضبط کر لئے۔

158۔ یہ امریکہ کو واضح وارننگ تھی۔ کریملن کہہ رہا تھا، ''اس سے زیادہ آگے نہیں بڑھنا''۔ لیکن امریکی حکمران اندھے، بہرے اور گونگے ہیں۔ 2013ء کے اواخر میں جب جرمنی یوکرین کے جھگڑے سے پیچھے ہٹنے کے لیے تیار تھا تو جان مکین اور اس کے ریپبلکن اتحادیوں نے مداخلت کی اور اوباما کو اس مسئلے میں الجھنے پر مجبور کیا۔ وہ جارجیا کے انتقام کے لیے روس پر کاری ضرب لگانا چاہتے تھے اور یوکرین کو یورپی یونین اور نیٹو کے قریب لانا چاہتے تھے۔ یہ خیال کہ پیوٹن یوکرین میں ہزیمت کو قبول کر لے گا بہت ہی احمقانہ تھا۔ اس سے زیادہ احمقانہ بات یہ توقع کرنا تھا کہ روس کریمیا کے نقصان کو بھی قبول کر لے گا جہاں سباسٹوپول میں روسی بحریہ کا ایک بڑا نیول بیس ہے۔

159۔ کیو(Kiev، یوکرین کا دارالحکومت) میں انتہا پسند قوم پرستوں اور فاشسٹ قوتوں کی حمایت سے دائیں بازو کے کُو (Coup) کے ذریعے وہ یانوکووچ کی حکومت کو گرانے میں کامیاب تو ہو گئے لیکن اس کام سے انہوں نے یوکرین کو معاشی انہدام اور خانہ جنگی کی کھائی میں گرا دیا۔ مغرب نے متوقع طور پر یوکرینی عوام سے کیا گیا کوئی ایک وعدہ بھی پورا نہیں کیا۔ نہ ہی وہ تمام تر دھونس اور دھمکیوں کے باوجود روس کے خلاف کھڑے ہو سکے۔

160۔ روس پر پابندیاں لگانے سے حکومت کمزور نہیں ہوئی بلکہ مزید مضبوط ہو گئی۔ یوکرین کے بحران اور امریکی پابندیوں سے پہلے پیوٹن زیادہ مضبوط نہیں تھا۔ لیکن ''روس کو سزا دینے کے لیے'' اٹھائے گئے امریکی اقدامات کا اُلٹ اثر ہوا۔ پیوٹن نے حب الوطنی کے جذبات کو استعمال کیا اور ایک مرحلے پر اس کی حمایت 90 فیصد تک پہنچ گئی تھی۔

161۔ بظاہر یہ پر تضاد لگتا ہے کہ یوکرین اور شام کے بحران سے پیوٹن مزید طاقتور ہوا۔ مغرب کی اسے تنہا کرنے کی کوششیں بری طرح ناکام ہو گئیں۔ شام میں اب وہی سیاہ و سفید کا مالک ہے اور اگر امریکہ روس پر پابندیاں برقرار رکھتا ہے تب بھی ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اس کے یورپی اتحادی اپنی پابندیاں ہٹا لیں گے۔ بحران زدہ یورپی معیشت کو روسی منڈی اور گیس کی بالکل اسی طرح ضرورت ہے جس طرح یورپی بورژوازی کو شام میں اپنا ڈالا ہوا گند کو صاف کرنے اور مہاجرین کی آمد کو روکنے کے لیے روس کی ضرورت ہے۔

162۔ اگر ہم اس کیفیت کو مزید گہرائی سے دیکھیں تو یہ واضح ہو گا کہ حالات اتنے مستحکم بھی نہیں ہیں جتنے نظر آتے ہیں۔ تیل کی گرتی ہوئی قیمتوں اور مغربی معاشی پابندیوں کی وجہ سے روسی معیشت کا زوال جاری ہے۔ حقیقی اجرتیں گر رہی ہیں۔ مڈل کلاس اب مزید لندن اور پیرس میں خوشگوار چھٹیاں نہیں گزار سکتی۔ روسی محنت کش یوکرین کے معاملے میں سرکاری پروپیگنڈے کے زیر اثر تھے۔ وہ یوکرینی فاشسٹوں اور انتہا پسند قوم پرستوں کی سرگرمیوں سے متنفر تھے اور پیوٹن نے مشرقی یوکرین میں ان کی اپنے بھائیوں بہنوں کے ساتھ فطری ہمدردی کے جذبات سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس بنیاد پر اس کی حمایت میں اضافہ ہوا۔

163۔ پیوٹن کچھ عرصے تک اقتدار پر اپنی گرفت مضبوط رکھ سکتا ہے لیکن ہر چیز کی حد ہوتی

ہے اور آخر میں تاریخ اپنی قیمت مانگتی ہے۔معاشی بحران کے باعث بہت سے محنت کشوں کے معیار زندگی میں گراوٹ آئی ہے خاص طور پر پیٹرز برگ اور ماسکو سے باہر۔عوام صبر کر رہے ہیں لیکن ان کے صبر کی بھی حد ہے۔ہم نے 2015ء کے آخر میں یہ دیکھا جب لمبے روٹ پر ٹرک چلانے والوں نے ہڑتال کر دی۔شاید ایک چھوٹی سی علامت،لیکن روسی محنت کش طبقے کی بے چینی کی یہ چھوٹی سی علامت جلد یا بدیر اپنا اظہار سنجیدہ احتجاجوں میں کرے گی۔

164۔ پیوٹن نے اعتماد محسوس کرتے ہوئے شام میں فوجی جارحیت کی جس سے مغرب کو جھٹکا لگا۔اس کے نتیجے میں ایک ایسا شخص جسے عالمی سطح پر اچھوت سمجھا جا رہا تھا اب شام میں قسمتوں کے فیصلے کر رہا ہے۔

165۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب اوباما اور جان کیری کریملن میں بیٹھے شخص کے خلاف آگ اگل رہے تھے۔لیکن پھر اچانک پیوٹن اقوام متحدہ میں آتا ہے اور توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔وہ امریکی صدر کے ساتھ عوام کے سامنے بھی آتا ہے اور ایک مصافحہ بھی ہوتا ہے جس کی خوب تشہیر کی جاتی ہے۔گو کہ یقینی ہے کہ اس میں اتنی گرمجوشی نہیں تھی۔

166۔ پیوٹن کا شام میں اصل مقصد اپنے قابل اعتماد اتحادی اسد کو اقتدار میں قائم رکھنا تھا اور اسلامی باغیوں کی پیش قدمی کو روکنا تھا جو اسد کے حمایتی علاقوں کے قریب پہنچ رہے تھے اور جہاں روس کے اڈے بھی ہیں۔کم از کم پیوٹن کے مقاصد واضح اور غیر مبہم تھے۔اسی لیے اس کی مضبوطی کا تاثر ملا۔

167۔اس کے برعکس اوباما کی کانگریس بہت زیادہ منقسم ہے اور ریپبلکن اپوزیشن باؤلی ہو چکی ہے۔اوباما عراق میں کسی زمینی جنگ کے خطرے کو جانتا ہے۔گو کہ امریکی میں پراپیگنڈا مشین کے ذریعے رائے عامہ کو جنگ کے حق میں تیار کیا جا رہا ہے لیکن وہ ماضی کے تجربے سے جانتا ہے کہ یہ تیزی سے اپنے الٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔یہی وجہ ہے، نہ کہ کوئی امن پسندی اور انسانی حقوق کا خیال، کہ ابھی تک وہ شام میں زمینی جنگ کے لیے فوج بھیجنے سے رکا ہوا ہے۔

168۔شام میں امریکی پالیسی کے تضادات کی وجوہات تلاش کرنا مشکل نہیں۔شام میں جہادیوں کے خلاف اگر کوئی سنجیدہ فوجی کاروائی ہوئی ہے تو وہ روسیوں نے بشارالاسد کی شامی فوج

کے ساتھ مل کر کی ہے۔اسی طرح عراق میں داعش کے خلاف کوئی فوجی کاروائی ہوئی ہے تو (کردوں کے علاوہ جو صرف اپنے علاقوں میں لڑیں گے) تو وہ امریکی حمایت یافتہ عراقی فوج نے نہیں کی بلکہ ایرانی حمایت یافتہ شیعہ ملیشیا نے اور ایرانی فوج کے دستوں نے کی ہے۔

169۔عملی طور پر امریکی روسیوں اور ایرانیوں کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ بشارالاسد کو مستقبل قریب کے لیے اقتدار میں رہنا چاہیے۔یہی وجہ ہے کہ اوباما ایران کے ساتھ جوہری ہتھیاروں پر ایک معاہدے پر پہنچا ہے جس سے سعودی اور اسرائیلی نفرت کر رہے ہیں اور ان کے امریکی کانگریس میں موجود پبلکن دوست بھی۔مختصراً اس کو ایک وقت میں تمام مشکلوں کا سامنا ہے۔اس لیے اوباما کی کمزوری کا تاثر ملتا ہے۔روسی قائد ماسکو اس یقین کے ساتھ پہنچا کہ شام کے متعلق امریکی صرف وہی کچھ کریں گے جو یوکرین میں کیا،یعنی کچھ خاص نہیں۔اور وہ غلط نہیں تھا۔

170۔روسیوں نے دمشق (شام کا دارالحکومت) کو اسلحے کی رسد دگنی کر دی اور اسلحہ اور دیگر ساز و سامان انڈیلنا شروع کر دیا۔انہوں نے داعش اور دوسرے نشانوں پر تباہ کن بمباری کی۔ روسی فضائی حملوں سے میدان جنگ میں طاقتوں کا توازن تبدیل ہو گیا۔اس کی وجہ سے امریکہ اور اس کے مغربی اتحادی مجبور ہوئے کہ وہ اپنی بمباری کو تیز کریں جواب تک داعش کو ختم کرنے کی بجائے اس کو بچا کر چلانے کے لیے تھی۔لہٰذا ہر قدم پر روسیوں نے امریکی سفارت کے گرد دائرے کھینچے ہیں۔شام میں واشنگٹن کو اپنی رعونت سے ہاتھ دھونے پڑے اور ماسکو کی شرائط تسلیم کیں۔اس سے طاقتوں کا توازن صرف شام میں ہی نہیں بلکہ پورے مشرقِ وسطیٰ میں تبدیل ہو گیا ہے۔

171۔مشرقِ وسطیٰ

172۔''یہ جرم سے بھی بدتر ہے، یہ غلطی ہے''۔فرانس کے ایک رئیس زادے لوئیس ہنری جسے فرانس کیخلاف برطانیہ کے لیے سازش کرنے پر نپولین نے قتل کیا، کے الفاظ امریکی سامراج کی حالیہ دہائیوں میں خارجہ پالیسیوں کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔

173۔آج مشرقِ وسطیٰ جس آگ کی لپیٹ میں ہے وہ امریکی سامراج کی عراق میں مجرمانہ جارحیت اوراس مصائب سے بھرے خطے میں مسلسل مداخلت کا براہ راست نتیجہ ہے۔عراق میں عدم استحکام پیدا کر کے اوراسے ایک جنگ سے تباہ حال کھنڈر میں تبدیل کر کے امریکہ اوراس کے اتحادیوں نے شام میں موجود رجعتی قوتوں کی مجرمانہ معاونت کی جواب ان کے مفادات کے لیے سنجیدہ خطرہ بن سکتے ہیں۔لیکن دہشت گردی کیخلاف نام نہاد جنگ، جو امریکہ اوراس کے اتحادی کئی سالوں سے عراق میں لڑ رہے ہیں، سے کچھ حاصل نہیں کر سکے۔

174۔واشنگٹن کے سیاستدانوں کو کچھ سمجھ نہیں آئی اور کچھ پیش بینی نہیں کر سکے۔ستم ظریفی یہ ہے کہ صدام حسین کی پرانی ریاستی مشینری اور عرقی فوج کو تباہ کر کے انہوں نے خطے میں طاقت کا توازن بگاڑ دیا اور خلا پیدا کر دیا جس میں ان کے پرانے دشمن ایران نے قدم رکھا۔جب امریکی فوج نے عراق پر حملہ کیا اس وقت وہاں القاعدہ کا کوئی وجود نہیں تھا۔لیکن اب پورا خطہ جہادی پاگل پن کی لپیٹ میں ہے۔یہ امریکی سامراج کی مداخلت کا براہ راست نتیجہ ہے۔

175۔دیر سے ہی سہی لیکن اب امریکی ان تباہ کن حالات کو دیکھ کر جاگ گئے ہیں جو انہوں نے ہی پیدا کیے ہیں اور اور اب خود انہیں دھمکا رہے ہیں۔اب امریکہ کو بڑھتے ہوئے جہادی تشدد کا سامنا ہے جو ایک ناقابل کنٹرول وبا کی طرح مشرقِ وسطیٰ سے شمالی افریقہ تک پھیل رہا ہے اور وہاں سے صحرائے صحارا پھلانگ کر نائیجیریا میں داخل ہوا ہے اور اس کے ہمسایہ ممالک نائیجر، چاڈ اور کیمرون کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔

176۔دنیا کی سب سے بڑی عسکری قوت ان خطرات سے کیسے نبرد آزما ہوگی؟ وہ ہوائی بمباری تک محدود اور مجبور ہو چکی ہے وہ بھی انتہائی بلندی سے۔لیکن یہ ایک کھلا راز ہے کہ صرف بمباری سے جنگیں نہیں جیتی جاتیں اور خاص طور پر عراق اور شام جیسی جنگیں۔امریکہ اوراس کے اتحادی ایک سال سے داعش کے ٹھکانوں پر بمباری کر رہے ہیں۔لیکن اس کے داعش پر کوئی خاص اثرات نہیں ہوئے۔

177۔یہ درست ہے کہ داعش والے اپنی ظالمانہ اور غیر انسانی سزاؤں، مثلاً مصلوب کرنے، گردن زنی، سنگ زنی، خواتین پر مظالم اور ثقافت اور تعلیم پر حملوں سے بدترین رجعت

پھیلا رہے ہیں اور سماج کو تاریکی اور قدامت میں لے جانا چاہتے ہیں۔لیکن یہ سب سامراج کے جرائم کا ہی عکس ہے جو اس نے اپنی بمباری، ابوغریب اور گوانتاناموبے میں قیدیوں پر تشدد اور غیر انسانی سلوک کی شکل میں کیے۔مشرقِ وسطیٰ میں 2001ء سے سامراج کی مداخلت سے 13 سے بیس لاکھ ہلاکتیں ہو چکی ہیں جبکہ کروڑوں بے گھر ہوئے ہیں اور اب بربریت کے حالات میں رہ رہے ہیں۔اسے Collateral Damage کا نام دیا جاتا ہے۔

178۔ سامراجیوں کو مشرقِ وسطیٰ میں جارحیت کے لیے ایک مجرمانہ بہانہ چاہیے اور جہادیوں کے قاتلانہ اعمال انہیں آسانی سے یہ دے دیتے ہیں۔سامراجی پراپیگنڈا مشین نے ایک بہت طاقتور داعش کا تاثر قائم کر دیا ہے۔لیکن واقعات ثابت کریں گے کہ داعش اتنی مضبوط نہیں جتنی دکھائی دیتی ہے۔روسیوں کی مداخلت کے بعد داعش اور دیگر جہادی گروپ دفاعی پوزیشن پر چلے گئے ہیں۔

179۔روسی مداخلت نے سب کچھ بدل دیا ہے۔انہوں نے امریکیوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ اپنی حرکت کو تیز کریں۔لیکن داعش کو شکست دینے کے لیے انہیں زمین پر فوجی درکار ہیں۔بس یہ فوجی امریکی نہیں ہونے چاہئے۔امریکی سپیشل فورسز کی ایک قلیل تعداد زمین پر موجود ہے، لیکن کس حد تک ہے یہ معلوم نہیں۔

180۔ بدقسمتی سے داعش کو شکست دینے کے لیے اوباما کو قلیل نہیں بلکہ بھاری تعداد میں قوتیں درکار ہیں۔یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ کچھ ناقابل علاج رجائیت پسندوں نے عراقی فوج سے امیدیں لگائی تھیں۔لیکن یہ تمام فریبوں سے زیادہ پرفریب امید تھی۔جب 2003ء میں انہوں نے عراقی فوج کو تباہ کیا تو امریکیوں نے خطے میں ایران کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والی واحد قوت کا خاتمہ کر دیا۔اب اس تباہ حال قوت کی بیچاری باقیات اتنی مایوس کن ہیں کہ داعش یا کسی اور قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔گزشتہ گرمیوں میں اس کی لڑنے کی صلاحیت کھل کر سامنے آئی جب وہ خوفزدہ خرگوشوں کی طرح موصل کو داعش کے جہادیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بھاگ گئے۔

181۔اسی طرح شام میں موجود ''معتدل اپوزیشن'' بھی صرف ایک کہانی ہی ہے۔کچھ کو چھوڑ کر اسد کے خلاف لڑنے والے تمام تر گروہ ایک یا دوسری قسم کے جنونی جہادی ہیں۔وہ داعش

کی بجائے اسد کیخلاف لڑنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ان ''معتدلوں'' (Moderates) کا اصل کام یہ ہے کہ وہ امریکی اسلحے کو جہادیوں تک پہنچانے میں پُل کا کردار ادا کریں۔امریکیوں نے اعلان کیا کہ وہ ان ''معتدلوں'' پر مشتمل پانچ ہزار افراد کی لڑاکا قوت تیار کریں گے لیکن اب وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اب ان میں سے چند ہی میدان میں بچے ہیں (وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں ایک راز ہے)۔دوسروں کو القاعدہ نے مروا دیا ہے جسے ان کے ٹھکانوں کی اطلاع امریکہ کے اتحادی ترکی کی جانب سے ملی یا پھر وہ خود ہی ہتھیار پھینک کر القاعدہ میں شامل ہو گئے۔

182۔ آخر میں امریکہ کو شام میں اپنے تمام منصوبے ترک کرنے پڑے۔ ''معتدل'' باغیوں کی حمایت کو تیزی سے کم کرنا پڑا۔اس دوران اسے اپنی حمایت YPG کی کرد قوتوں کو دینی پڑی۔YPG کے گرد انہوں نے شامی جمہوری قوت (SDF) اور جمہوری شامی کانگریس (DSC) بنائی ہے۔

183۔YPG شام میں بہت کارآمد ثابت ہوئی ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ پاپولر ملیشیا جمہوری اور غیر فرقہ پرور پروگرام پر کاربند ہے۔پچاس سے ستر ہزار قوتوں کے ساتھ یہ اسد کی فوج کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔لیکن اسد کی فوج تربیت، مورال اور جذبے میں ان سے بہت پیچھے ہے۔جمہوری شامی کانگریس کے قیام سے یہ ازخود ایک چھوٹی کردریاست بن چکی ہے۔

184۔اس وقت مشرقِ وسطیٰ میں YPG بلاشبہ سب سے ترقی پسند تحریک ہے۔لیکن امریکہ اسے رجعتی مقاصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔امریکی سامراج شام کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کرنا چاہتا ہے جو مختلف ملیشیا اور قبائلی سرداروں کے تسلط میں ہوں اور انہیں ایک دوسرے کیخلاف لڑا کر اپنے مقاصد حاصل کر سکے۔سامراجیوں کے لیے چھوٹی قوموں کے لیے حق خودارادیت کا نعرہ ہمیشہ ایک رجعتی دھوکہ اور جال رہا ہے۔اس وقت وہ کردوں کو داعش کیخلاف لڑائی میں استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔لیکن ایک مخصوص مرحلے پر وہ کردوں کیخلاف تقسیم کرو اور حکومت کرو کا طریقہ استعمال کریں گے۔کرد تحریک کے ترقی پسند پہلوؤں اور ان کے حق خودارادیت کا دفاع کرتے ہوئے مارکسسٹوں کو یہ تنبیہہ بھی لازمی کرنی چاہیے کہ کردوں کے مفادات کو امریکی سامراج کے عزائم کے ساتھ نہیں جوڑنا چاہیے، اور کرد قیادت کی کوتاہیوں

اور غیر مستقل مزاجی پر تنقید کرنی چاہیے۔

185۔کردوں کی جانب امریکی پالیسی میں تبدیلی کے باعث واشنگٹن اور اس کے اتحادی ترکی میں اختلافات ابھرے ہیں۔اس سے ترکی کے ساتھ جڑے القاعدہ کے پراکسی گروپوں کو امریکیوں کی بالواسطہ یا بلاواسطہ حمایت ختم ہوئی ہے۔ترکی YPG اور اس کی جڑواں تنظیم PKK کو خطرہ سمجھتا ہے اور امریکہ کی نئی پالیسی سے الگ ہوگیا ہے۔اس سے ایک چھوٹی جنگ کی صورتحال پیدا ہوگئی ہے جو امریکی اتحادی SDF اور سعودی اور ترکی کے اتحادی اسلامی پراکسی گروپوں میں ہورہی ہے۔یہ کسی بھی لمحے ایک بڑی جنگ بن سکتی ہے۔

186۔کردوں کی حمایت کے علاوہ امریکہ کو احساس ہوا ہے کہ اسے ایرانی حمایت یافتہ قوتوں کی بھی ضرورت ہے اور ساتھ ہی اسد حکومت کی بھی تاکہ شام میں استحکام کو برقرار رکھا جاسکے اور اسلامی بنیاد پرستوں کی حکومت سے بچا جائے۔ہر کوئی جانتا ہے کہ عراق میں لڑائی کا بیڑا، سوائے ان کردوں کے جو صرف اپنے علاقوں میں لڑائی میں دلچسپی رکھتے ہیں، ایرانی حمایت یافتہ شیعہ ملیشیا اور پاسداران انقلاب نے اٹھایا ہے اور یہ کہ عراقی فوج کی تربیت اور کمانڈ ایرانی افسروں کے پاس ہے۔اسی طرح ''معتدل اسلام پسندوں'' پر مشتمل کسی قوت کی تعمیر کا مقدر ناکامی ہی ہے۔مختلف گروہ داعش سے لڑنے کی بجائے اسد اور ایک دوسرے سے لڑنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔القاعدہ اور نئی بننے والی SDF (امریکی حمایت یافتہ گروپ جس میں YPG اور مشکوک مگر غیر جہادی FSA کی باقیات شامل ہیں) کے درمیان لڑائیوں میں اضافہ ہوا ہے۔

187۔اسی لیے شام میں حکومت کی تبدیلی کا پرزور مطالبہ بڑے آرام سے بھلا دیا گیا ہے اور امریکہ نے تہران کی جانب اپنا متحارب رویہ ختم کر کے ایران سے جوہری ہتھیاروں پر ایک بے اعتبار سا معاہدہ کیا ہے اور پابندیاں کم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔یہ بلاشک وشبہ واشنگٹن کی شکست اور تہران کی اہم سفارتی فتح تھی۔ایران کے پاس اب جنوبی، مشرقی اور وسطی عراق کا کنٹرول ہے (داعش مغرب اور کردشمال کو کنٹرول کرتے ہیں)۔ایران کا شام میں بھی اثر ورسوخ ہے اور ساتھ ہی لبنان میں جہاں ایران کی حامی حزب اللہ کی مضبوط بنیاد ہے۔

188۔ دانت پیستے ہوئے واشنگٹن واحد ممکنہ رستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوا ہے جو کہ ایران اور روس سے معاہدہ تھا۔لیکن یہ اب وہ شیطانی ایران نہیں جسے کچھ عرصہ پہلے تک امریکی اخبار ''برائی کی جڑ'' قرار دیتے تھے۔زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب کیری تہران کے خلاف اپنے منہ سے آگ اگلتا تھا۔لیکن اب تہران کے ساتھ تعلقات میں سب کچھ میٹھا اور روشن ہے۔کیری صاحب اب مفاہمتی تقریریں کرتے ہیں اور دانت نکال کر مسکراتے ہیں اور ساتھ ہی ایران کی قیادت کی دانشمندی اور معتدل مزاجی کے گن گاتے ہیں۔

189۔ امریکہ کے روس سے تعلقات میں بھی ایسا ہی ہے۔زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب پیوٹن کو انسانی تہذیب سے خارج قرار دیا جا رہا تھا۔ایک ایسا شخص جس کا ناطقہ بند کر دینا چاہیے۔لیکن اب اچانک وہ شام کا ہیرو بن گیا ہے۔یہ تبدیلی ریاض اور انقرہ میں الارم بجا رہی ہے۔امریکی سامراج کو اس وقت ایک پر پیچ دوراہے کا سامنا ہے اور اس عمل میں وہ نئے ناقابل حل تضادات میں گھر گئے ہیں۔یہ سفارتی قلابازیاں اس تباہی کی نشاندہی کرتی ہیں جو امریکیوں نے مشرقِ وسطیٰ میں مچائی ہے۔بغداد کی حکومت ایران پر بہت زیادہ انحصار کرتی ہے۔سعودی عرب اور دیگر ممالک کو خوف ہے کہ عراق ایران کے اختیار میں آ گیا ہے۔امریکہ کو ایسے نتیجے کی خواہش نہیں تھی لیکن اس کے تمام اعمال کا یہی انجام ہونا تھا۔

190۔ ان کا شام کی جانب رویہ زیادہ متضاد ہے۔عوام کے سامنے وہ اسد کی مذمت کرتے ہیں اور شام میں روسی ''مداخلت'' کی شکایت کرتے ہیں لیکن حقیقت میں کشیدگی میں کمی ہوئی ہے۔امریکی شکایت کرتے ہیں کہ روسی انہیں شام میں موجود نشانوں کے بارے میں پوری اطلاعات فراہم نہیں کرتے اور اس لیے انہیں فضائی حملوں میں مطابقت پیدا کرنے میں مشکلات پیش آتی ہیں اور حادثات کا خدشہ ہے وغیرہ وغیرہ۔وہ یہ بھی شکایت کرتے ہیں کہ روسی افواج داعش کے ٹھکانوں کے علاوہ مغربی ممالک کی حمایت یافتہ ''معتدل'' قوتوں پر بھی بمباری کرتی ہیں جو کہ شامی افواج پر بھی حملہ آور ہیں۔لیکن روسی اس پر توجہ نہیں دیتے اور اپنے نشانوں پر ڈھٹائی سے بمباری کر رہے ہیں۔

191۔سعودی عرب اور یمن

192۔ پرانا قول ہے کہ قوموں کے دوست نہیں ہوتے، مفادات ہوتے ہیں۔مشرقِ وسطیٰ میں امریکہ چار بڑی علاقائی قوتوں میں توازن پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے جن میں ایران، سعودی عرب، اسرائیل اور ترکی شامل ہیں۔اس عمل میں وہ کبھی ایک جانب جھکتا ہے اور کبھی دوسری جانب۔عراق میں امریکی جہازوں نے ایران کی زمینی افواج کے ساتھ مل کر حملے کیے جبکہ یمن میں امریکہ سعودیوں کی جانب سے ایرانی حمایت یافتہ حوثی باغیوں پر حملوں کی حمایت کرتا ہے۔امریکہ نے کہا ہے کہ وہ سعودیوں کو اسلحے کی فراہمی تیز کر رہا ہے، لیکن ساتھ ہی اوباما انتظامیہ تہران کو اشارے دے رہی ہے کہ وہ ایران کے ساتھ یمن کے مسئلے پر الجھنا نہیں چاہتی۔

193۔سعودی حکمران طبقہ خطے میں رد انقلاب کا مرکز ہے۔کئی دہائیوں تک مغربی لیڈر رجعتی سعودی بادشاہت کی حمایت کرتے رہے۔اس کے تمام ظالمانہ جرائم کو غلامانہ انداز میں قبول کرتے رہے اور اس قابل نفرت مخلوق کا پچھواڑا چاٹتے رہے جو ریاض میں حاکم ہیں۔شاہ عبداللہ کے بے ماتمی جنازے پر ہمیں یہی نظر آیا۔

194۔ یہ پرہیز گار مسلمان اور حرمین شریفین کے پاسبان امریکہ کے سب سے وفادار اتحادی ہیں جنہوں نے گزشتہ صرف ایک سال میں 50 سے زائد افراد کی گردن زنی کی۔کوڑے اور صلیب پر لٹکانے جیسی دیگر خوشگوار سزائیں اس کے علاوہ ہیں۔لیکن بوسیدہ سعودی ریاست متزلزل بنیادوں پر قائم ہے۔سعودی عرب کی مظلوم شیعہ آبادی اور نوجوانوں کے بڑے حصے میں ہیجان موجود ہے۔یہ کسی لمحے پر بغاوت میں تبدیل ہوسکتا ہے۔وہابی رجعتی ملاؤں میں بھی بے صبری موجود ہے جو داعش اور القاعدہ سے زیادہ ہمدردی رکھتے ہیں اور شاہی خاندان کو ناجائز سمجھتے ہیں۔یہ تضاد ریاست کو کمزور کر رہا ہے جو اپنے اقتدار کو بچانے کے لیے سرگرداں ہے۔

195۔یہ وہ بنیادی وجوہات تھیں جن کی وجہ سے یمن کے واقعات پر سعودی عرب کا ردعمل سامنے آیا۔ایران کی جانب امریکی خارجہ پالیسی میں تبدیلی سے واشنگٹن کے لیے زیادہ پیچیدگی پیدا ہوئی۔ایران کے حوثیوں سے اچھے تعلقات ہیں جو ایک مقبول پروگرام پر پورے یمن میں

پھیل گئے اور عدن کا کنٹرول سنبھال کر سعودی کٹھ پتلی کو نکال باہر کیا۔ جواب میں سعودی عرب نے اپنی فضائیہ کو حکم دیا کہ یمن پر بمباری کرے۔

196۔ سعودیوں نے جلدی میں دس ممالک کا اتحاد بنایا تا کہ یمنی بغاوت کو خون میں ڈبویا جا سکے۔ امریکہ اور برطانیہ نے ہچکچاہٹ سے اس اتحاد میں شمولیت اختیار کی اور وہ براہ راست بمباری میں شامل نہیں ہوئے۔ اتحادیوں نے پورے ملک پر ظالمانہ بمباری کی ہے اور اس کے انفرااسٹرکچر کو تباہ کیا ہے، سکولوں اور ہسپتالوں کو تباہ کیا ہے اور بڑی تعداد میں عام شہریوں کو قتل کیا ہے۔ دو کروڑ افراد کو امداد کی اشد ضرورت ہے۔ اس تباہ کن بمباری کے باوجود حوثیوں کو ختم نہیں کیا جا سکا اور آبادی کی اکثریت میں سعودیوں اور ان کے اتحادیوں کے خلاف نفرت موجود ہے۔ یہ حقیقت کہ پاکستانی افواج نے یمن میں حوثی باغیوں کے خلاف زمینی حملے میں سعودیوں کی درخواست کے باوجود حصہ لینے سے انکار کر دیا ہے، اس بات کا کافی ثبوت ہے کہ یہ حملہ ناکامی سے دوچار ہوگا۔

197۔ موجودہ حکمران گروہ آگ سے کھیل رہا ہے۔ پرانا بادشاہ عبداللہ بہت محتاط انسان تھا جو ایسی بیرونی مہم جوئیوں میں مداخلت سے پرہیز کرتا تھا جو اس کی ریاست کو غیر مستحکم کریں۔ لیکن اس کے جانشین زوال پذیر نو دولتیے، جاہل، بیوقوف اور ضرورت سے زیادہ پراعتماد ہیں۔ اپنے ناقابل شکست ہونے کے احساس سے اندھے ہو کر انہوں نے ایک نہ جیتی جانے والی جنگ شروع کر دی ہے۔ یمن میں عسکری مداخلت کر کے سعودی اپنی ریاست کو عدم استحکام سے دوچار کرنے کا خدشہ پیدا کر چکے ہیں بلکہ ایک بغاوت بھی مشتعل ہو سکتی ہے۔

198۔ سعودی عرب جان بوجھ کر حوثیوں کے خلاف فرقہ وارانہ نفرت پھیلا رہا ہے۔ اس کی وجہ سے ملک کے بڑے حصوں میں القاعدہ مضبوط ہوئی ہے۔ نمر النمر کے عدالتی قتل کا حکم سعودی شاہی خاندان نے دیا تھا۔ یہ ایک سوچی سمجھی اشتعال انگیزی تھی تا کہ شیعہ سنی تنازعے کو بڑھاوا دیا جائے اور تہران میں حکومت کو سعودی عرب کے خلاف فوجی کاروائی پر اکسایا جائے۔ اس کے بعد سعودیوں نے امریکہ سے مدد کی درخواست کرنی تھی۔

199۔ اس کے فوری بعد تہران میں سعودی سفارت خانے پر حملہ ہوا اور سعودی عرب نے

سفارتی تعلقات ختم کر لیے۔ یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا گیا۔ یہ واقعات قدم بہ قدم کیے گئے جیسے کوئی رقاصہ اپنے قدم اٹھاتی ہے۔ لیکن یہ موت کا رقص ہے۔ یہ ایک ایسی ریاست کا عمل ہے جو شدید مشکلات میں ہے اور اسے اپنے اکھاڑے جانے کا خدشہ ہے۔

200۔ سعودی غنڈوں نے یمن کا غلط حساب لگایا۔ اس سے سعودی عرب میں موجود شیعوں میں غصہ بھر گیا ہے جو ملک کی آبادی کا بیس فیصد ہیں اور سب سے مظلوم اور غریب ہیں۔ مختلف شہروں میں عوامی جلوس نکلنے شروع ہو گئے جن میں نعرہ لگ رہا تھا ''الموت یا سعود''۔ اپنی حدود سے باہر نکل کر سعودی حکمران طبقے نے ہواؤں کو چھیڑا ہے اور اب طوفانوں میں گھر جائیں گے۔

201۔ ترکی

202۔ سعودی عرب اور اسرائیل کے ساتھ ترکی بھی خطے میں ایک اہم رد انقلابی قوت ہے۔ گو کہ وہ رسمی طور پر نیٹو کا حصہ ہے لیکن اردگان کی رجعتی حکومت کے تحت ترکی داعش اور دیگر اسلامی بنیاد پرستوں کی حمایت کر رہا ہے۔

203۔ اردگان کے علاقائی عزائم پوشیدہ نہیں۔ وہ پرانی سلطنت عثمانیہ جیسی ریاست دوبارہ کھڑی کرنا چاہتا ہے جس میں وسطی ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے بڑے حصے ترکی کے زیر اثر ہوں۔ اس خواہش کو لے کر وہ ترک بولنے والے لوگوں جیسے کہ ترکمان، کو اپنے جنونی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے، جیسا کہ ماضی میں زار روس نے سلاو لوگوں کو اپنی سامراجی خارجہ پالیسی کے لیے استعمال کیا۔

204۔ یہ بھی کھلا راز ہے کہ اردگان داعش اور دیگر اسلامی بنیاد پرستوں کی حمایت کرتا ہے تا کہ بشار الاسد کا تختہ الٹ کر شام کے علاقے ہتھیا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے بہت سے اسلامی بنیاد پرستوں کو ترکی کی سرحد عبور کر کے شام میں جانے کی اجازت دی ہے جبکہ داعش کیخلاف لڑنے والی قوتوں کو اسلحے اور رضا کاروں کی رسد روکی ہے۔ وہ داعش کیخلاف لڑنے والے کردوں کو بھی ظالمانہ انداز میں کچل رہا ہے۔

205۔ ترکوں کی جانب سے روسی جنگی جہاز کو مار گرانے کا مقصد بھی امریکہ اور روس میں

تنازعہ پیدا کرنا تھا۔ترکی نیٹو کا ممبر ہے اور اس نے اپنے اتحادیوں سے مدد کی اپیل کی ہے۔لیکن ترکی کے ''اپنی قومی سالمیت کا تحفظ کرنے کے حق'' کے بیان جاری کرنے کے علاوہ نیٹو نے کچھ نہیں کیا۔جبکہ پیوٹن نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے روسی S-400 میزائل سسٹم شام منتقل کر دیا ہے۔اس طرح اس نے شام کی فضائی حدود کا کنٹرول سنبھال لیا ہے۔

206۔اردگان کی اشتعال انگیزی سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔اس کی وجہ سے فرانسیسی صدر نے ماسکو کا دورہ منسوخ نہیں کیا اور داعش کے خلاف بڑے عالمی اتحاد کا اعلان بھی کیا۔درحقیقت اردگان کی حکومت مستحکم نہیں۔2013ء میں پورے ترکی میں ہونے والے عوامی مظاہرے مستقبل کی نوید ہیں۔

207۔اسرائیل

208۔فلسطین کا سوال ابھی تک حل نہیں ہوا اور مشرقِ وسطیٰ کی سیاسی زندگی میں مسلسل زہر گھول رہا ہے۔عباس اور فلسطینی اتھارٹی کی اسرائیل کو اقوام متحدہ اور دیگر عالمی تنظیموں میں تنہا کرنے کی کوششیں بیکار ہیں۔

209۔اوباما انتظامیہ اور اسرائیل کے درمیان مخاصمانہ تعلقات کھل گئے جب نیتن یاہو نے گزشتہ سال امریکی کانگریس سے خطاب کرنے کے لیے ریپبلکنز کی دعوت قبول کی۔

210۔جب نیتن یاہو منتخب ہوا تو وائٹ ہاؤس نے رسمی مبارکباد سے اجتناب کیا۔اوباما نے کوئی فون نہیں کیا۔اس کی بجائے اسرائیلی وزیراعظم کو وزیرخارجہ جان کیری کی جانب سے ایک مختصر فون کیا گیا۔یہ چھوٹا سا واقعہ امریکہ اور اسرائیل میں بڑھتے ہوئے تضادات کا پتہ دیتا ہے۔

211۔واشنگٹن پر دباؤ ڈالنے کے لیے نیتن یاہو نے بدترین بلیک میلنگ کی۔اسرائیلی خفیہ ایجنسی نے ایران اور امریکہ کے درمیان جوہری مذاکرات کے لیے ''خفیہ'' ہدایات کی تفصیلات حاصل کر لیں۔اس کے لیے انہوں نے امریکی افسران، مخبروں، یورپ میں سفارتی رابطوں اور جاسوسی کو استعمال کیا۔انہوں نے یہ حساس معلومات کانگریس کے ممبران کو دے دیں۔

212۔ان طریقوں سے نیتن یاہو ایران کے ساتھ معاہدے کو سبوتاژ کرنا چاہتا تھا۔وال

سٹریٹ جرنل نے سینئر امریکی افسر کا بیان شائع کیا کہ ''امریکہ اور اسرائیل کا ایک دوسرے کی جاسوسی کرنا ایک بات ہے۔ لیکن اسرائیل کا امریکی راز چرانا اور اسے لے کر امریکی ممبران پارلیمنٹ کے ساتھ کھیلنا اور امریکی سفارت کاری کو کمزور کرنا الگ بات ہے''۔

213۔ یہ کشیدگی مزید گہری ہوئی جب نیتن یاہو نے دو ریاستی حل کو یکسر رد کر دیا جو کہ امریکی پالیسی کی بنیاد ہے۔ وائٹ ہاؤس نے انتباہ کیا کہ اوباما انتظامیہ نیتن یاہو سے اپنے تعلقات پر نظر ثانی کرے گی۔

214۔ اسرائیل نے مغربی کنارے پر اپنی آہنی گرفت قائم رکھی ہوئی ہے۔ غزہ کا پھندا بھی دھیرے دھیرے سخت کیا جا رہا ہے اور یہودی آبادکاری کو بے شرمی سے پھیلایا جا رہا ہے۔ فلسطینیوں کی قیادت بالکل خصی ہے جس کے باعث نوجوان جان جوکھوں میں ڈال کر مہم جوئی کرتے ہیں۔ اس سے نیتن یاہو فائدہ اٹھاتا ہے۔ ایک مفاہمتی حل ڈھونے میں ناکامی اوباما اور امریکی سامراج کے لیے بڑا دھچکا ہے۔

215۔ چین کا ابھار

216۔ مشرق میں امریکہ کو چین کے ابھار کا چیلنج درپیش ہے۔ 2008ء کے بحران کے بعد چین نے زائد سرمائے (یعنی زائد پیداوار) کو جذب کر کے عالمی معیشت کو بچایا۔ لیکن اب دنیا میں چین کا کردار اپنے الٹ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ایک ابھرتی ہوئی معاشی قوت کے طور پر چین اپنی صنعتوں کے خام مال کے لیے بھوکا تھا اس لیے اس نے افریقہ اور لاطینی امریکہ میں مداخلت کر کے وہاں سے خام مال نکالا۔ لیکن اب اسے خود زائد پیداوار کے بحران کا سامنا ہے۔

217۔ 1914ء سے پہلے کے جرمنی کی طرح چین میں اکٹھی ہونے والی پیداواری قوتوں کو اس کی سرحدوں میں نہیں روکا جا سکتا۔ اس کی وجہ سے ہمسایہ ریاستوں اور بڑی سامراجی طاقتوں سے تنازعات ابھر رہے ہیں۔ چینی ریاست کے معاشی سٹیملس پیکج زیادہ دیرپا ثابت نہیں ہو سکے۔ چین مجبور ہے کہ وہ بڑی مقدار میں موجود سستی مصنوعات سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے انہیں عالمی منڈی میں پھینکے۔ اس لیے عالمی معیشت میں چین کا کردار تبدیل ہو گیا ہے۔

218۔ ماضی میں جرمنی کی ہی طرح آج چین عالمی معاملات میں طاقت اور اثر ورسوخ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے جس سے اس کی معاشی طاقت کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ زیر اثر علاقوں کی تقسیم نو چاہتا ہے۔ چین کے ان عزائم کو پہلے سے موجود طاقتیں، جاپان اور امریکہ، اپنے لئے خطرہ سمجھتی ہیں۔ سب کے سامنے تو امریکہ کہتا ہے کہ چین کا ایک طاقت کے طور پر ابھار بڑا خوش آئند ہے اور یہ کہ چین عالمی اقدار کی پابندی کرے اور ''کثیر الجہتی نظام'' میں اپنا کردار ادا کرے۔ لیکن عملی طور چین عالمی سطحپر جب بھی کچھ کرتا ہے تو امریکہ اسے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔

219۔ امریکہ نے آئی ایم ایف جیسے اداروں میں چین کا اثر ورسوخ بڑھنے سے منظم انداز میں روکا ہے۔ یہاں تک کہ آئی ایم ایف کے وسائل میں اضافہ کرنے کی عاجزانہ پیشکش کو بھی (جس سے چین کے ووٹ بڑھ جانے تھے) کئی سالوں تک کانگریس میں لٹکایا گیا۔ عالمی بینک میں بھی چین کے وزن بڑھانے کی کوشش کو امریکہ نے سبوتاژ کیا ہے۔ خطے میں چین کے بڑھتے اثر و رسوخ کو روکنے کے لیے وہ خطے میں بحرالکاہل کے گیارہ ممالک کو ملا کر TPP (ٹرانس پیسیفک پارٹنرشپ) بنا رہا ہے۔ لیکن چین خطے میں اپنا اثر بڑھا رہا ہے جس سے امریکیوں کو خاصی خفت ہے۔

220۔ ہمیں ایشین انفرااسٹرکچر انوسٹمنٹ بینک (AIIB) کے قیام میں یہ نظر آیا۔ ہمیشہ کی طرح امریکہ روکے رکھنے کی پالیسی پر کاربند ہے۔ چین ایک بڑی معاشی قوت کے طور پر ابھرا ہے اور معاشی طاقت کو سیاسی قوت میں تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ اب اس کے پاس دنیا کے سب سے بڑے غیر ملکی زرمبادلہ کے ذخائر ہیں جن کے ساتھ وہ ایک نئے بینک کا آغاز کرتے ہوئے ایشیا میں پلوں، سڑکوں اور دیگر ضروریات کی تعمیر کے منصوبے بنا رہا ہے۔

221۔ چین کا حکمرن طبقہ یقینی بنانا چاہتا ہے کہ اس کی عسکری قوت اور سیاسی اثر ورسوخ اس کی معاشی طاقت سے مطابقت میں آجائیں۔ اس کی توسیع پسندانہ پالیسیاں بحرالکاہل میں امریکہ کے ساتھ تضاد میں آ رہی ہیں جو دنیا کی تاریخ میں فیصلہ کن خطہ بننے جا رہا ہے۔ اس امر سے درست طور پر خوفزدہ ہوتے ہوئے کہ نئے بینک کو چینی ایسے خطے میں اپنے اثر ورسوخ کے لیے

استعمال کریں گے جو امریکی مفادات کے لیے بھی اہم ہے، امریکی اس منصوبے کو سبوتاژ کر رہے ہیں۔ پسِ پردہ امریکہ نے اتحادیوں پر دباؤ ڈالا ہے کہ وہ اس میں شامل نہ ہوں۔

222۔ برطانیہ ایشیا سے باہر پہلا ملک تھا جس نے اس کی ممبر شپ کے لیے درخواست دی، اس وقت ایک امریکی اہلکار نے شکایت کی کہ برطانیہ میں چین کو ''مسلسل گنجائش'' دینے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کیمرون نے چینی صدر شی جن پنگ کو لندن دعوت پر بلایا اور بکنگھم محل میں ملکہ کے ساتھ پرتکلف عشائیہ بھی دیا۔ یورپی طاقتیں بیجنگ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی ہیں۔ برطانیہ کے بعد جرمنی، فرانس اور اٹلی نے اعلان کیا کہ وہ بھی اس بینک کے تاسیسی ممبر بننا چاہتے ہیں۔

223۔ 2016ء میں شنگھائی سے کنمنگ تک ایک تیز ترین ریلوے لائن مکمل ہو جائے گی جس سے چین کی جنوب مشرقی ایشیا میں توسیع کو بڑھاوا ملے گا۔ اس کے علاوہ AIIB، جو چین کی قیادت میں پہلا کثیر الملکی مالیاتی ادارہ ہے، جسے 2015ء میں قائم کیا گیا، اس سے چین کو موقع ملے گا کہ وہ اپنے وسیع مالیاتی ذخائر کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرے۔

224۔ گزشتہ دو سالوں سے چین جنوب چینی سمندر میں مصنوعی جزائر بنا رہا ہے۔ جواب میں امریکیوں نے ایک مصنوعی جزیرے کے قریب بحری جنگی جہاز بھیجا ہے تا کہ ''جہاز رانی کی آزادی'' کے حق کا تحفظ کیا جا سکے۔ اس عمل میں چینی بحریہ کا سربراہ اکیلا نہیں تھا کہ جسے یہ ''پوشیدہ دھمکی'' نظر آئی۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ پوشیدہ نہیں تھی۔

225۔ ایڈمرل وو شینگلی نے کہا کہ اس کی طاقتیں ''اشتعال انگیز کاروائیوں'' کے جواب میں ''بہت صبر'' دکھا چکی ہیں۔ ماضی میں ان اختلافات پر جنگیں چھڑ جاتی تھیں۔ لیکن اب طاقتوں کا توازن ڈرامائی طور پر بدل چکا ہے۔ اب چین وہ غریب، کچلا ہوا نیم نوآبادیاتی ملک نہیں جہاں جاپان، برطانیہ اور امریکہ گھس سکیں۔ امریکی تو شمالی کوریا کیخلاف کوئی کاروائی نہیں کر سکے جو انہیں مسلسل مشتعل کر رہا ہے۔ اس لیے وہ چین کی عسکری قوت سے ٹکرانے کی ہمت نہیں کریں گے۔

226۔ ایک کھرب ڈالر کی شاہراہ ریشم پر مبنی حکمت عملی جس میں پاکستان، افغانستان

اور وسطی ایشیا کے ممالک شامل ہیں اس کی وجہ جہاں تزویراتی مفادات ہیں (ملاکا کی خلیج کو بائی پاس کرنے کے لیے) وہاں زائد پیداوار کو برآمد کرنا بھی مقصود ہے۔ شاہراہ ریشم کے منصوبے میں شامل ممالک کو دیئے جانے والے قرضوں کا 70 فیصد اس شرط پر دیا جاتا ہے کہ وہاں کام چینی کمپنیاں کریں گی۔ لیکن اس سے ان ممالک کے درمیان اور داخلی سطح پر تنازعات ابھر رہے ہیں۔

227۔ پاک چین اقتصادی راہداری ایک دیوہیکل منصوبہ ہے جو جنوب مغرب میں گوادر کی بندرگاہ کو چین کے خودمختار علاقے سنکیانگ سے جوڑے گا۔ یہ اکیسویں صدی کی شاہراہ ریشم کے مجوزہ منصوبے کی توسیع ہے۔ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس سے پاکستان کو ٹرانسپورٹ، انفرااسٹرکچر، ٹیلی کمیونیکیشن اور توانائی کے شعبوں میں فائدہ ہوگا۔ درحقیقت یہ پاکستان کو چین کی سیٹلائٹ ریاست بنانے کا منصوبہ ہے۔

228۔ چین کو مغربی علاقے میں تجارتی رستے کھلنے سے فائدہ ہوگا اور چین کو بحیرۂ عرب کے رستے مشرقِ وسطیٰ تک براہ راست رسائی حاصل ہوگی اور ملاکا کی خلیج والے لمبے رستے سے چھٹکارا ملے گا۔ اس میں سڑکیں، ریلوے کے ساتھ ساتھ گیس اور تیل کی پائپ لائنیں بھی تعمیر کی جائیں گی اور چین کو مشرقِ وسطیٰ سے جوڑا جائے گا۔ گوادر میں چین کے آنے سے بحرِ ہند میں بھی اس کا اثر ورسوخ بڑھے گا، جو بحرِ اقیانوس اور بحرالکاہل کے درمیان تیل کی تجارت کا اہم رستہ ہے۔

229۔ چینی اشرافیہ کی کوشش ہے کہ اسے چینی ریاست کے سیاسی اور تزویراتی مفادات کے لیے استعمال کیا جائے۔ اس منصوبے کو امریکی سامراج اور بلوچ قوم پرستوں کے ایک حصے کی جانب سے مخالفت کا سامنا ہے۔ اس سے گوادر میں رہنے والوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا جو انتہائی بدترین حالات میں کام کرتے ہیں اور زندگی گزارتے ہیں۔ بلکہ اس کے برعکس انہیں ان کے حقوق سے محروم کیا جارہا ہے۔ سندھ اور دیگر قومیتوں میں بھی خفگی پائی جاتی ہے جہاں سے یہ ''راہداری'' نہیں گزر رہی۔ لہٰذا چین کی توسیع پسندانہ پالیسی کے باعث پاکستان اور پورے خطے میں تضادات بڑھ رہے ہیں۔

230۔ پاکستان، افغانستان اور بھارت

231۔ دنیا کی آبادی کا پانچواں حصہ برصغیر جنوبی ایشیا میں بستا ہے جہاں اتنے قدرتی وسائل موجود ہیں کہ زمین پر جنت تعمیر کی جا سکے۔لیکن رسمی آزادی کی سات دہائیوں کے بعد بھی صدیوں سے آباد یہ خطہ غربت، محرومی، جہالت اور ظلم کا ایک سمندر بنا ہوا ہے۔ یہ جنگوں اور بدترین نسلی اور مذہبی تشدد میں گھرا ہوا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے سرمایہ دار بورژوا جمہوری انقلاب کا کوئی ایک بنیادی فریضہ پورا کرنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتے۔ وہ آزادی سے پہلے کی نسبت آج سامراج کے زیادہ غلام ہیں۔ پاکستان جاگیرداری کو مکمل طور پر ختم نہیں کر سکا جبکہ ہندوستان ظالمانہ اور رجعتی ذات پات کا نظام ختم نہیں کر سکا۔

232۔ پاکستان میں عوام کی صورتحال ہندوستان سے بھی بدتر ہے۔ دونوں ممالک میں عوام کا استحصال مزید بدتر ہو جاتا ہے جب زہریلے سیاست دان، کاروباری سیٹھ اور فوجی جرنیل کرپشن اور لوٹ مار کرتے ہیں۔ دونوں ممالک میں صحت اور تعلیم کی بجائے فوج پر بڑے پیمانے پر رقم خرچ کی جاتی ہے۔

233۔ پاکستان میں حکمران گروہ کی رد انقلابی حکمت عملی کے باعث افغانستان اور پاکستان میں انتہائی خوفناک صورتحال پیدا ہو چکی ہے۔ حکمران طبقہ اور فوج منشیات کی اسمگلنگ اور دیگر مجرمانہ کاروائیوں میں بڑے پیمانے پر ملوث ہیں۔

234۔ یہی وہ حقیقی بنیادیں ہیں جن پر طالبان اور بنیاد پرست بلائیں پلتی ہیں۔ بنیاد پرستوں کے مختلف گروہوں اور ریاست کے درمیان لڑائیوں کی بنیاد کالے دھن کے وہ وسیع ذخائر ہیں جو منشیات کی تجارت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کی تخلیق اور حوصلہ افزائی پاکستانی خفیہ ایجنسی آئی ایس آئی نے کی تھی جس میں امریکی سامراج مکمل طور پر شریک تھا تاکہ افغانستان میں رد انقلاب کی مدد کی جا سکے۔ اس کا نتیجہ بہت بڑی تباہی کی صورت میں نکلا ہے۔

235۔ طالبان کے باؤلے رجعتی عناصر اور دیگر اسلامی بنیاد پرست اب کنٹرول سے باہر ہو چکے ہیں۔ اس کا خوفناک اظہار دسمبر 2014ء میں پشاور میں آرمی پبلک سکول پر خونریز حملے

سے ہوا جس میں پاکستانی طالبان نے 132 بچوں اور 9 اساتذہ کو قتل کر دیا۔ یہ فوجی افسران کے بچے تھے۔ اس کے نتیجے میں فوج طالبان کے خلاف کاروائیاں تیز کرنے پر مجبور ہوئی جو اس سے پہلے اس کی کٹھ پتلیاں اور گماشتے تھے۔

236۔ سامراج اور اس کے مقامی گماشتے اس ثقافت کو تباہ کرنے کے ذمہ دار ہیں جو کبھی ایشیا میں اعلیٰ ترین تھی۔ انہوں نے بے قابو بلائیں تخلیق کی ہیں، ایسے باؤلے کتے جو اپنے آقا کو بھی کاٹ لینے سے نہیں ہچکچاتے۔ افغانستان میں پندرہ سال کے سامراجی قبضے نے عام لوگوں کے لیے کچھ بہتر نہیں کیا۔ خواتین پر ظلم اسی طرح جاری ہے۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں، جس پر مغربی مبصرین بہت شور مچاتے ہیں، مزید بڑھی ہیں۔

237۔ کابل میں حکومت مایوس کن انداز میں پھوٹ چکی ہے اور بحران میں ہے۔ اس کا خصی پن طالبان کے ان علاقوں میں حملوں سے ظاہر ہوتا ہے جنہیں محفوظ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے نتیجے میں سامراجی مجبور ہیں کہ وہ اپنی فوجیں وہاں موجود رکھیں جنہیں وہ واپس لے جانا چاہتے تھے۔ کابل کی حکومت امریکی سنگینوں کے سہارے کھڑی ہے۔ امریکیوں کے بغیر یہ فوراً ہی اکھڑ جاتی۔

238۔ کچھ عرصے پہلے تک برصغیر کی تاریکی میں بھی امید کی کچھ کرن موجود تھی۔ ہندوستان کے سرمایہ دار اپنی معیشت کی ترقی کی بڑھکیں مار رہے تھے۔ وہ ''ایشین ٹائیگر'' بننے کی بات کر رہے تھے۔ لیکن یہ اس دور کی بات ہے جب عالمی معیشت پھیل رہی تھی۔ اس میں بھی اس ترقی کے فوائد ایک مراعات یافتہ حصے کو ہی پہنچے تھے۔ بہت بڑی اکثریت کے حالات بہتر نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اب بھارتی معیشت عالمی بحران کی یخ بستہ ہواؤں کو محسوس کر رہی ہے۔ روپے کی قدر میں تیزی سے کمی ہوئی ہے۔ ہندوستان نے اپنی تقدیر عالمی سرمایہ دارانہ منڈی سے باندھ دی ہے۔ یہ عالمی سرمایہ داری کے بحران سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔

239۔ اپنی کامیابی کی تمام تر مکاری کے باوجود نریندرا مودی کی حکومت شدید مشکلات میں ہے۔ اس کی پارٹی بی جے پی ایک اہم ریاست بہار میں انتخابات ہار گئی۔ ووٹروں نے سب سے زیادہ خوراک کی قیمتوں میں اضافے کی شکایت کی۔ تیل کی گرتی ہوئی قیمتوں کے باعث

ہندوستان میں جب سے مودی وزیراعظم بنا ہے، افراط زر کنٹرول میں ہے۔لیکن کچھ اشیائے خورد ونوش کی قیمتوں میں اضافے کے باعث افراط زر گزشتہ چند ماہ میں بڑھی ہے۔الیکشن کمپئین کے دوران ارہر دال، جو کہ خوراک کا اہم حصہ ہے، کی قیمت میں اضافہ ہوگیا اور یہ کمپئین کا مرکزی مسئلہ بن گیا۔

240۔صورتحال کا حقیقی اظہار ستمبر 2015ء میں عام ہڑتال سے ہوا جس کا اعلان دس بڑی ٹریڈ یونینز نے کیا تھا۔ٹریڈ یونین اور کمیونسٹ لیڈر توقع کر رہے تھے کہ دس کروڑ محنت کش اس ہڑتال میں حصہ لیں گے۔یہ عدد بھی ہندوستان کے محنت کش طبقے کے دیوہیکل ہونے کا اظہار ہے۔لیکن اس ایک دن کی عام ہڑتال میں 15 کروڑ محنت کشوں نے حصہ لیا۔یہ لازمی طور پر تاریخ کی سب سے بڑی عام ہڑتالوں میں سے ایک ہوگی۔

241۔صرف پرولتاریہ اور اس کے ساتھ فطری اتحادی غریب کسان ہی اس سرمایہ داری اور سامراجیت کی تاریکی سے نجات کا رستہ نکال سکتے ہیں جس نے اس قدیم اور خوشحالی کے وسائل سے بھرپور خطے کو غرق کیا ہوا ہے۔

242۔جنوبی افریقہ

243۔جنوبی افریقہ براعظم افریقہ کا کلیدی ملک ہے۔یہاں کی معیشت اور محنت کش طبقہ سب سے بڑا ہے اور یہاں قابل فخر انقلابی روایات موجود ہیں۔ANC(افریقن نیشنل کانگریس) کے لیڈروں کی مذاکراتی مہارت کی وجہ سے نہیں بلکہ انقلابی عوام کی وجہ سے 1992ء میں نسل پرست حکومت کو اکھاڑ پھینکا گیا تھا۔لیکن ANC کی قیادت میں چوبیس سال کی رسمی جمہوری حکومت کے باوجود معدنی وسائل پیدا کرنے والے دنیا کے دوسرے بڑے ملک میں عوام کی اکثریت کی حالت تبدیل نہیں ہوئی۔

244۔اس کی وجہ سے انقلابی نفسیات موجود ہے خاص طور پر نوجوان نسل میں، جن کو آزادی کی تحریک کے پرانے لیڈروں سے کوئی توقعات نہیں۔ان لیڈروں میں سے بہت سے سرمایہ دار طبقے کا حصہ بن چکے ہیں۔ماریکانا کا قتل عام یاد رہنا چاہئے جب سیاہ فام محنت کشوں پر

ANC کی حکومت نے گولی چلوائی تا کہ کانوں کی صنعت کے (سیاہ اور سفید) مالکان کا دفاع کیا جا سکے، اس سے حکمران طبقے کی جانب بہت سے لوگوں کا رویہ تبدیل ہوا۔ ANC کو آج بہت سے لوگ کرپشن، چوری اور لوٹ مار کا گڑھ سمجھتے ہیں۔

245۔ میٹل ورکرز کی انقلابی یونین NUMSA جس کے چار لاکھ ممبران ہیں اس تین پارٹی الائنس سے الگ ہو چکی ہے۔ NUMSA کے لیڈروں نے علیحدہ پارٹی بنانے کا اعلان کیا ہے۔ اگر یہ بن جاتی ہے تو ANC کے لیے مشکلات کھڑی کرے گی۔ لیکن NUMSA کے لیڈر ٹھوس فیصلے نہیں کر پا رہے ہیں اور ANC کے دائیں بازو کے ساتھ عدالتی مقدمے بازی اور بیوروکریٹک لڑائیوں میں الجھے ہوئے ہیں۔

246۔ اس خلا میں جولیس مالیما، ANC کے یوتھ ونگ کا سابقہ لیڈر اور اس کی پارٹی اکنامک فریڈم فائٹرز نے قدم رکھا ہے۔ ان کی انقلابی تقریروں نے انہیں بہت مقبول بنا دیا ہے خاص طور پر نوجوانوں میں۔ اس سے دیوہیکل انقلابی امکانات کی عکاسی ہوتی ہے جو جنوبی افریقہ کے سماج میں پنپ رہے ہیں۔

247۔ انقلاب افریقہ کے دیگر حصوں کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ گزشتہ سال ٹوگو، برونڈی اور سب سے بڑھ کر برکینا فاسو کے واقعات نے اس کا اظہار کیا۔ ان ممالک میں انقلابی تحریکیں ابھری ہیں۔ برکینا فاسو میں ہم نے دیکھا کہ ایک عوامی تحریک نے فوجی کُو کی ایک کوشش کو الٹ دیا۔ اس سے اظہار ہوتا ہے کہ نسبتاً غیر ترقی یافتہ ممالک میں بھی انقلاب کے لیے موافق حالات ہیں۔

248۔ وینزویلا اور اصلاح پسندی کی حدود

249۔ لاطینی امریکہ میں صورتحال تبدیل ہو چکی ہے۔ معاشی ترقی کے باعث نسبتاً استحکام کے دس سال کا دور اب اختتام پذیر ہو چکا ہے۔ اس کے بہت اہم سماجی اور سیاسی مضمرات ہیں۔

250۔ برازیل میں صورتحال ڈرامائی طور پر تبدیل ہو چکی ہے اور معیشت سنجیدہ گراوٹ کا شکار ہے جس سے جی ڈی پی میں 4.5 فیصد کی گراوٹ آئی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ محنت کش طبقے کے خلاف دیگر اقدامات کے باعث اس حقیقت پر توجہ مرکوز ہوئی ہے کہ PT سرمایہ داری

کے مفادات کا دفاع کرتی ہے، نہ کہ محنت کشوں کے۔اس کی وجہ سے PT کمزور ہوئی ہے۔وہ دن گئے جب عوام پارٹی کے ساتھ وفادار تھے۔اس کی جگہ اب لوگوں میں ریڈیکلائزیشن ہے، خاص طور پر نوجوانوں میں جس کا اظہار ہڑتالوں اور مظاہروں کے ایک سلسلے سے ہوا ہے۔

251۔ ارجنٹائن کے صدارتی انتخابات میں ماریشیو ماکری کی کامیابی سے کرچنرسٹ پاپولزم کے بارہ سالہ دور کا خاتمہ ہوا۔اس کے اختتام پر معیشت بحران میں ہے، زرمبادلہ کے ذخائر کم ہو رہے ہیں، افراط زر تقریباً 25 فیصد ہے اور بجٹ خسارہ جی ڈی پی کا 6 فیصد ہے۔اس نے دائیں بازو کی کامیابی کی بنیاد رکھی۔لیکن اگر کرچنرسٹ دانیال سکیولی جیت بھی جاتا تو اسے بھی انہی پالیسیوں کو جاری رکھنا تھا۔سرمایہ داری کے بحران کے باعث اس کے پاس زیادہ گنجائش نہیں تھی۔

252۔اس سے پاپولزم کی حدود بھی عیاں ہوتی ہیں جو سرمایہ دار طبقے اور سامراجی جکڑ کے خاتمے کے بغیر سرمایہ داری کے تضادات کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔یعنی وہ ناممکن کو ممکن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''انقلابی'' لفاظی کو ہٹا کر دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ پاپولزم بائیں بازو کی اصلاح پسندی کی ہی ایک شکل ہے جسے لاطینی امریکہ کی روایات اور نفسیات کے تحت ڈھالا جاتا ہے۔آخری تجزیے میں پاپولزم کا مطلبی تذبذب ہے۔

253۔ وینزویلا میں شاویز کسی دوسرے کی نسبت سوشلسٹ انقلاب کے قریب ترین آیا۔لیکن وہ کبھی بھی اسے مکمل نہیں کر سکا۔اس کے انتقال کے بعد تمام تضادات سطح پر آ گئے ہیں جن کے مضمرات تباہ کن ہیں۔

254۔نکولس ماڈورو کے پاس نہ تو اس کے پیش رو کی بصارت ہے نہ ہی وہ جرات۔وہ انقلاب فرانس کے رابس پیئر کی یاد دلاتا ہے جو انقلاب کو بچانے کے لیے بار بار عوام کو پکارتا تھا، آخر ایک دن عوام نے اس کو جواب نہیں دیا۔جب رابس پیئر دائیں جانب گیا تو اس کی حالت ایسے شخص کی تھی جو اسی شاخ کو کاٹ رہا ہو جس پر وہ بیٹھا تھا۔اپنی عوامی بنیادوں کو مایوس کرنے کے بعد بولیویرین قیادت نے اپنی تباہی کی بنیادیں تیار کر لی ہیں۔

255۔6 دسمبر 2015ء کو وینزویلا میں انتخابی شکست انقلاب کو مکمل کرنے سے انحراف کی وجہ سے ہوئی، حکمران طبقے کے اثاثوں کی ضبط کیا گیا نہ سرمایہ دارانہ ریاست کو تباہ کیا گیا۔سرمایہ

داری کو قیمتوں اور غیر ملکی زرمبادلہ کے ذریعے چلانے کی کوشش نے بڑے پیمانے پر معاشی بگاڑ پیدا کیا۔ بولیویرین قیادت نے تیل کی آمدن کو سماجی اصلاحات اور عوامی فلاحی پروگراموں کے لیے استعمال کیا۔ عالمی سطح پر تیل کی قیمت میں گراوٹ کے بعد ان کے پاس کچھ زیادہ کرنے کی گنجائش نہیں بچی تھی۔

256۔ سرمایہ داری کو کنٹرول کرنے کی کوششوں کی وجہ سے بگاڑ پیدا ہوا جس کے باعث ناگزیر طور پر پُر انتشار صورتحال پیدا ہوئی۔ انتہائی زیادہ افراط زر، اسمگلنگ، بلیک مارکیٹ، کرپشن اور جرائم کا ایک گھن چکر شروع ہو گیا۔ ماڈورو کی حکومت سرمایہ داری کی سخت حدود میں رہتے ہوئے ان مسائل کو حل نہیں کر سکتی تھی۔ عوام کے اہم حصے کا حکومت پر اعتماد ختم ہو گیا جس سے انتخابات میں شکست ہوئی۔ 2013ء کے صدارتی انتخابات سے لے کر 2015ء کے پارلیمانی انتخابات تک PSUV اور اس کے اتحادی 7,587,532 ووٹوں سے کم ہو کر 5,599,025 ووٹوں پر چلے گئے۔ دوسرے الفاظ میں PSUV کے بیس لاکھ ووٹ کم ہو گئے۔ دوسری جانب رد انقلابی اپوزیشن 7,363,264 ووٹوں سے بڑھ کر 7,707,422 ووٹوں پر چلی گئی۔ اس کے ووٹوں میں 344,000 کا اضافہ ہوا۔

257۔ یہاں سوشلزم یا انقلاب ناکام نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس یہ اصلاح پسندی، ادھورے اقدامات، کرپشن اور بیوروکریسی کا نتیجہ تھا۔ رد انقلابی اپوزیشن اب دوتہائی اکثریت کے ساتھ ترقی پسند قوانین کو الٹنے کے لیے جارحانہ حملے کرے گی، ریاست کے کلیدی حصوں کا کنٹرول حاصل کرنے کی کوشش کرے گی، نیشنلائز کی جانے والی کمپنیوں اور زمینوں کی نجکاری کرے گی، قیمتوں اور غیر ملکی کرنسی پر موجود کنٹرول ختم کرے گی اور صدر کے عہدے کے لیے ریفرنڈم کروانے کے حالات بنائے گی۔

258۔ وینزویلا میں 6 دسمبر کی شکست ''تیل کے سوشلزم'' کے کھوکھلے پن کو عیاں کرتی ہے، جیسے یونان میں سپراس کے گھٹنے ٹیکنے سے بائیں بازو کی اصلاح پسندی کی حدود اور تضادات عیاں ہوئے ہیں۔ عملی طور پر یہ ایک ہی چیز ہے: سرمایہ داری سے انقلابی علیحدگی کے بغیر سوشلسٹ پالیسیوں پر عملدرآمد کی یوٹوپیائی کوشش۔ ان پالیسیوں کا انجام عوام کی مایوسی کی

شکل میں نکلتا ہے، سوشلزم پر ان کا یقین تباہ ہوتا ہے اور ایک یا دوسری صورت میں رجعت کی کامیابی کا رستہ ہموار ہوتا ہے۔

259۔ مارکس نے وضاحت کی تھی کہ رد انقلاب کا کوڑا انقلاب کو آگے لے جا سکتا ہے۔ تذبذب کے ناگزیر دور کے بعد انقلابی عوام متحرک ہو کر براہ راست عمل سے رد انقلاب کی کوشش کی مزاحمت کریں گے۔ انتخابات میں شکست سے بولیورین کیمپ میں داخلی صف بندی کا عمل بھی تیز ہو گا۔ قیادت کے اندر اپوزیشن سے مفاہمت کا دباؤ ڈالنے والے ہوں گے۔ بد عنوان ترین اور زوال پذیر عناصر جہاز سے چھلانگ لگا کر دائیں بازو کی صفوں میں شامل ہو جائیں گے۔ لیکن عام انقلابی کارکنان زیادہ اہم نتائج اخذ کریں گے اور مارکسی نظریات کی طرف مائل ہوں گے۔ اس باعث بولیورین تحریک میں مارکسی نظریات کے لیے نئے اور موافق حالات پیدا ہوں گے۔

260۔ طریقہ کار اور عوامی تنظیمیں

261۔ تناظر ایک سائنس ہے جبکہ طریقہ کار ایک فن ہے۔ کام کے درست طریقہ کار بنانے کے لیے ہم مستقبل کے عمومی تناظر اور خدوخال کو بنیاد نہیں بنا سکتے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ تناظر مشروط ہوتے ہیں، یہ کوئی کوہِ طور سے آنے والے صحیفے نہیں جو ہر وقت اور ہر صورتحال کے لیے کارگر ہوں۔ تناظر کو مسلسل جدید کرنے کی ضرورت ہے اور انہیں موجود حالات سے مطابقت میں لانا چاہیے۔ ہمیں تناظر کو بہتر اور تبدیل کرنا چاہیے یا اگر ضروری ہو تو پھاڑ کر پھینک دینا چاہیے اور دوبارہ شروعات کرنی چاہیے۔

262۔ طریقہ کار کی بنیاد ٹھوس حالات پر ہونی چاہیے جو مسلسل تبدیل ہو رہے ہیں۔ جب طریقہ پر بحث ہو رہی ہو تو ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ ہم کوئی ایسا فارمولا نہیں بنا رہے جو ہر چیز پر پورا اترے۔ ہمیں لچک دار ہونے کی ضرورت ہے، صورتحال پر نظر رکھنے کی ضرورت ہے اور اس کی تبدیلی پر، اور اسی دوران اپنی قوتوں کو تعمیر کرنا ہے تاکہ جب موقع ملے تو مداخلت کر سکیں۔

263۔ طریقہ کار پر کام کرتے ہوئے ہمیں عوامی تنظیموں میں جاری عوامل کو بھی توجہ سے

دیکھنے کی ضرورت ہے۔ یہ وقت کے ساتھ تبدیل ہوں گے اور عوامی تحریک کے مدوجزر کی عکاسی کریں گے۔ نسبتاً طبقاتی امن کے طویل ادوار میں مزدور تحریک غیر طبقات کے دباؤ میں آ جاتی ہے۔ عوامی پارٹیوں اور یونینز پر بیوروکریسی کی گہری تہہ جم جاتی ہے۔

264۔ محنت کشوں کی متحرک شرکت کے بغیر ان عوامی تنظیموں کی اندرونی زندگی جمود کا شکار ہو جاتی ہے۔ ان کی اوپری پرتیں بورژوازی کے اثر میں آ جاتی ہیں۔ بحران سے کئی دہائیاں پہلے سے نام نہاد سوشلسٹ اور سوشل ڈیموکریٹک پارٹیاں رد اصلاحات کر رہی تھیں جن میں نجکاری، ڈی ریگولیشن اور کٹوتیاں شامل ہیں۔ جب 2008ء میں بحران کا آغاز ہوا تو سرمایہ دار طبقے نے اقتدار اصلاح پسندوں کے حوالے کر دیا تا کہ وہ سرمایہ داری کو بچانے کا غلیظ کام کریں اور محنت کشوں پر وحشیانہ حملوں کا آغاز کریں (اسپین، یونان، وغیرہ)۔ ایسے حالات میں پرانی اور مستحکم پارٹیاں اپنی عوامی بنیادیں تیزی سے کھو سکتی ہیں۔ پرانا توازن تباہ ہو چکا ہے۔ ہم ایک نئے دور میں داخل ہو چکے ہیں جو اچانک تبدیلیوں، بحرانوں اور پھوٹ کا دور ہے جس میں کچھ پارٹیاں معدوم ہو جائیں گی جبکہ نئی سیاسی تشکیل کے مظاہر ابھریں گے۔

265۔ پاسوک کی زوال پذیری اور گراوٹ کے باعث یونان میں سائریزا کا ابھار ہوا۔ اسی طرح PSOE کی غداری اور کمیونسٹ پارٹی کی اصلاح پسندانہ زوال پذیری کے باعث اسپین میں پوڈیموز ابھری۔ اس قسم کا عمل وینزویلا میں شاویز اور بولیورین تحریک کے ابھرنے میں بھی نظر آیا تھا۔

266۔ جہاں ایسی تحریکیں ابھرتی ہیں ہمیں ان مظاہر پر نظر رکھنی چاہیے اور ان کے ساتھ یا گرد کام کرنا چاہیے۔ وہ نظریاتی طور پر کنفیوز اور تنظیمی طور پر کمزور ہوتے ہیں۔ اگر وہ محنت کش طبقے میں جڑیں نہیں بناتے اور واضح طور پر سرمایہ داری کیخلاف مؤقف نہیں رکھتے تو وہ اسی طرح ختم ہو سکتے ہیں جیسے وہ ابھرے تھے۔

267۔ پچھلے عرصے میں مزدور تحریک میں حاوی رجحان دائیں بازو کی اصلاح پسندی تھا۔ لیکن سرمایہ دارانہ بحران کے حالات میں اصلاح پسند تنظیمیں بحران میں داخل ہوں گی۔ اس کے باعث بائیں جانب بائیں بازو کی اصلاح پسندی کی طرف جھکاؤ ہو سکتا ہے، جو ہمیں برطانیہ

میں پہلے ہی نظر آ رہا ہے، یا پھر اگر کوئی بایاں بازو نہیں بنتا تو یہ تنظیمیں منہدم ہو سکتی ہیں۔

268۔ جہاں روایتی عوامی پارٹیاں منہدم ہوئی ہیں یا بہت زیادہ کمزور ہوئی ہیں وہاں ہمیں کچھ ملکوں میں نئی اشکال کا ابھار نظر آیا ہے۔ ہمیں یہ اہم نکتہ سمجھنا چاہئے کہ عوام چھوٹے گروپوں میں متحرک نہیں ہوتے۔ فرقہ پروروں کا یہ خیال کہ صرف اعلان کر دینے سے انقلابی پارٹی بن جاتی ہے بیوقوفانہ ہے اور حقیقت سے متضاد ہے۔ جہاں پرانی تنظیموں نے غداری کی ہے وہاں عوام نئی تنظیموں کے گرد جمع ہو سکتے ہیں لیکن ہمیشہ عوامی تنظیموں میں۔ یہ تنظیمیں بائیں بازو کی اصلاح پسندی کی جانب بڑھیں گی اور واقعات کے تھپیڑوں میں سنٹرازم کی جانب بھی۔

269۔ ہمیں نہیں بھولنا چاہیے کہ دائیں بازو اور بائیں بازو کی اصلاح پسندی میں فرق صرف نسبتی ہے۔ اصلاح پسندی کا عرق، خواہ وہ بائیں قسم کی ہو یا دائیں، یہ ہے کہ سرمایہ داری کو اکھاڑنا ضروری نہیں اور یہ ممکن ہے کہ سرمایہ داری میں رہتے ہوئے محنت کشوں اور کچلے ہوئے طبقات کی حالت بہتر کی جا سکے۔ لیکن یونان کا تجربہ بتاتا ہے کہ یہ ممکن نہیں۔ یا تو آپ سرمائے کی آمریت کو تباہ کرنے کے لیے ضروری اقدامات کریں یا پھر سرمایہ آپ کو تباہ کر دے گا۔

270۔ ہمارا یہی مطلب ہے جب ہم کہتے ہیں کہ اصلاح پسندی کے بطن میں غداری موجود ہے۔ یہ جان بوجھ کر غداری کرنے کا مسئلہ نہیں بلکہ سادہ سی حقیقت ہے کہ اگر آپ سرمایہ داری کو قبول کر لیں تو آپ کو اس نظام کے تمام قوانین کو بھی قبول کرنا پڑتا ہے۔ موجودہ حالات میں اس کا مطلب ہے کہ آپ کٹوتیوں کی پالیسی پر عمل کریں۔ سپراس کا کیس اس سلسلے بہت کچھ سکھاتا ہے۔

271۔ بائیں بازو کے اصلاح پسندوں کی تنقیدی حمایت کرتے ہوئے ہمیں کوئی غلط توقعات نہیں پیدا کرنی چاہئیں یا پھر ان کے کسی عمل کی ذمہ داری قبول نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں یاد کرنا چاہیے کہ جب تک اس کی پالیسیوں کا امتحان نہیں ہوا تھا اس وقت تک سپراس کی مقبولیت بہت زیادہ تھی۔ آخر میں اس نے بورژوازی کے دباؤ میں آ کر ہتھیار ڈال دیئے اور مصالحت کر لی۔ وہ لوگ جو سمجھتے تھے کہ ہم سپراس پر زیادہ تنقید کرتے ہیں اب ہمارے خیالات غور سے سنیں گے۔

272۔ ہمیں دوسروں سے اپنا فرق واضح کرنا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ ہمیں فرقہ پروروں والے

نفرت انگیز لہجے سے بھی پرہیز کرنا ہوگا۔ ہمیں ہم کلام ہونے کی ضرورت ہے، ایک دوستانہ انداز میں اور جس چیز کی ہم حمایت کرتے ہیں اس پر زور دیتے ہوئے، لیکن ساتھ ہی یہ وضاحت کرتے ہوئے کہ ہمیں آگے جانے کی ضرورت ہے تاکہ سرمایہ داری کو ختم کیا جاسکے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اگر وہ بینکوں اور کلیدی صنعتوں کو نیشنلائز نہیں کرتے تو وہ (اصلاح پسند) اپنی مجوزہ اصلاحات کا خرچہ کہاں سے لائیں گے؟

273۔ پچھلے عرصے میں عوامی تنظیموں کے دائیں جانب جانے کے باعث بہت سے بائیں بازو کے گروپوں نے الٹرالیفٹ مؤقف اپنایا اور ان عوامی تنظیموں کو یکسر رد کر دیا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ ان پرانی تنظیموں کے بائیں جانب الگ سے ایک متبادل تعمیر کر سکتے ہیں۔ لیکن تمام فرقوں کی نئی انقلابی پارٹیوں کے اعلان کرنے کی کوششیں بری طرح ناکام ہوئی ہیں۔ الٹرالیفٹ اس لیے ناکام ہوئے ہیں کیونکہ وہ عوام کی اصل تحریکوں اور تنظیموں کو نظر انداز کرتے ہیں۔ لیکن الٹرا لیفٹ ازم ناگزیر طور پر موقع پرستی میں جا گرتا ہے۔ عوام کی توجہ حاصل کرنے کے لئے وہ اپنے پروگرام پر پانی پھیرنے لگتے ہیں۔

274۔ عام طور پر موقع پرستی، جو عام طور پر خود کو ''عبوری پروگرام'' کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتی ہے، اس کا انجام ہمیشہ بند گلی میں ہوتا ہے۔ اگر عوام کو ایک اصلاح پسند پروگرام کی ضرورت ہو تو بہت سے اصلاح پسند لیڈر ہیں جن سے رجوع کر سکتے ہیں۔ عبوری پروگرام کوئی انفرادی اصلاح پسند مطالبات کا سلسلہ نہیں ہے جس میں سے آپ اصلاح پسندی کے مطابق اپنی مرضی کی چیز نکال لیں۔ یہ عالمی سوشلسٹ انقلاب اور محنت کشوں کے اقتدار کے لیے ایک مکمل پروگرام ہے۔

275۔ اس مرحلے پر ہماری ترجیح یہ ہے کہ ہم سماج کی اس پرت کی جانب رخ کریں جہاں ہم اپنا کام فی الوقت تعمیر کر سکتے ہیں نہ کہ مستقبل میں۔ یہ عمومی طور پر نوجوان ہیں جو انقلابی نظریات کی طرف مائل ہیں۔ نوجوانوں کو جیت کر اور انہیں مارکسزم کے نظریات کی تربیت دے کر ہم عوامی تنظیموں میں کامیاب کام کی بنیادیں رکھ رہے ہیں اس وقت کے لئے جب حالات تیار ہوں گے۔

276۔ایک نیا دور

277۔پہلی عالمی جنگ سے قبل کی دو دہائیوں پر مشتمل معاشی ترقی کا طویل دور وہ مٹی تھی جس میں اصلاح پسندی کو جڑیں میسر آئیں۔یہ ابہام پیدا کیا گیا کہ پارلیمانی سیاست اور ٹریڈ یونینز کے ذریعے سرمایہ داری کو بتدریج بہتر کیا جا سکتا ہے۔یہ ابہام 1914ء میں ٹوٹ گئے۔عالمی جنگ نے ایک نئے دور کا اعلان کیا۔جنگوں،انقلابات اور ردانقلابات کا دور۔

278۔45-1914ء تک کا دور اپنے سے پہلے دور سے بالکل مختلف تھا۔یہ تباہی کا دور تھا جس میں پرانا توازن ختم ہو گیا تھا۔طوفانی طبقاتی جدوجہدوں کے تجربے سے محنت کش انقلابی نتائج اخذ کر رہے تھے۔سماجی اور معاشی بحران نے پرانی اصلاح پسند تنظیموں کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔محنت کشوں کی پارٹیاں بحران کا شکار ہو گئیں۔انقلاب روس کے زیر اثر بائیں بازو کے عوامی رجحانات تشکیل پائے جس سے بڑی کمیونسٹ پارٹیاں وجود میں آئیں۔

279۔ یہاں اس عمل کو تفصیل سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔اتنا کہنا کافی ہو گا کہ سوشل ڈیموکریٹک اور سٹالنسٹ قیادتوں کی غداریوں کے نتیجے میں جرمن اور ہسپانوی انقلاب کی شکست ہوئی جس نے دوسری عالمی جنگ کی راہ ہموار کی۔دوسری عالمی جنگ ایک انوکھے انداز میں ختم ہوئی جس کی پیش بینی ٹراٹسکی نہیں کر سکا تھا،جیسے روز ویلٹ،سٹالن،چرچل اور ہٹلر نہیں کر سکے تھے۔

280۔ہم ماضی میں اس پر بات کر چکے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ دہرایا جائے کہ دوسری عالمی جنگ کے بعد سرمایہ داری کی بحالی کی کیا وجوہات تھیں۔عالمی معیشت ایک ابھار کے دور میں داخل ہوئی جو کئی دہائیوں تک جاری رہا اور یورپ،شمالی امریکہ،جاپان کے ترقی یافتہ سرمایہ دارانہ ممالک کے عوام کے شعور پر اپنے نقوش مرتب کیے۔پہلی عالمی جنگ سے پہلے کے دور کی طرح اس دوران اصلاح پسندی میں خوش فہمیوں نے تقویت حاصل کی۔کئی دہائیوں تک مارکسسٹ عوام سے دور ہو گئے اور دریا کی مخالف سمت میں تیرتے رہے۔

281۔ہم یہاں سرمایہ دارانہ صنعتی ممالک کے حالات کی بات کر رہے ہیں۔افریقہ،ایشیا اور لاطینی امریکہ کے نوآبادیاتی یا نیم نوآبادیاتی ممالک کے عوام کی صورتحال مختلف تھی۔اس پورے

عرصے کے دوران، چین، الجزائر، انڈوچائنہ، بولیویا، کیوبا، چلی، ارجنٹائن، وسطی افریقہ، انڈونیشیا اور برصغیر میں مسلسل اکھاڑ پچھاڑ جاری رہی۔ لیکن نوآبادیاتی انقلاب جو لاکھوں لوگوں کو سڑکوں پر لایا تھا اسے سٹالنزم نے مسخ کیا۔ کئی جگہوں پر سٹالنسٹوں کی قیادت کے باعث عوام کو شکست ہوئی۔ اگر کہیں وہ اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوئے، جیسا کہ چین، تو انہوں نے سٹالنسٹ روس کے ماڈل پر ریاستیں تعمیر کیں جن میں یورپ اور امریکہ کے صنعتی ممالک کے محنت کشوں کے لیے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

282۔ اس دور میں سٹالنزم کی جانب سے ادا کیا جانے والا منفی کردار پیچیدہ عنصر تھا۔ ہم روس اور مشرقی یورپ کی بیوروکریٹک مسخ شدہ ریاستوں کے سوال کو فی الحال چھوڑ دیتے ہیں، وہ ایک الگ معاملہ ہے۔ اتنا کہنا کافی ہوگا کہ 1953ء میں مشرقی جرمنی اور 1956ء میں ہنگری اور پھر پولینڈ اور چیکوسلواکیہ کی تحریکوں کو یا تو قوم پرستانہ خطوط پر موڑ دیا گیا یا پھر روسی بیوروکریسی نے انہیں کچل دیا۔ مغربی یورپ اور امریکہ کی بورژوازی سٹالنسٹوں پر انگلی اٹھا سکتی تھی اور محنت کشوں کو کہہ سکتی تھی کہ: تم کمیونزم چاہتے ہو؟ یہ ہے تمہارا کمیونزم!'' اور بہت سے محنت کشوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ''جس شیطان کو تم جانتے ہو وہ اس شیطان سے بہتر ہے جسے تم نہیں جانتے۔''

283۔ یورپی پرولتاریہ کی انقلابی صلاحیت اس وقت نظر آئی جب عالمی جنگ کے بعد کے معاشی عروج کی انتہا پر 1968ء میں فرانس کے محنت کشوں نے تاریخ کی عظیم ترین عام ہڑتال برپا کی۔ درحقیقت 1968ء میں طاقت فرانس کے محنت کشوں کے پاس تھی لیکن سی جی ٹی اور کمیونسٹ پارٹی کی قیادت نے اس فیصلہ کن لمحے پر غداری کی۔ 1968ء کے فرانس کے واقعات یورپ میں 1970ء کی دہائی میں ہونے والے زیادہ ڈرامائی واقعات کے پیش رو تھے۔ اس وقت 1945ء کے بعد پہلا سنجیدہ معاشی بحران بھی موجود تھا۔ اس وقت یونان، پرتگال، اسپین میں انقلاب تھے جبکہ اٹلی اور دوسرے ممالک میں انقلابی تحریکیں تھیں۔

284۔ 1930ء کی طرح ایک دفعہ پھر پرتگال، اسپین، یونان، برطانیہ، فرانس اور اٹلی میں عوامی تنظیموں میں بائیں بازو اور یہاں تک کہ سنٹرسٹ رجحانات تھے۔ لیکن جب قیادت نے ان انقلابی تحریکوں کو زائل کیا تو یہ رجحانات ختم ہو گئے۔ جیسے ہی بائیں بازو کے اصلاح پسند لیڈر اقتدار

کے قریب ہوئے انہوں نے اپنی بائیں بازو کی خطابت ترک کر دی اور تیزی سے دائیں جانب بڑھے۔ یہ سرمایہ داری کی بحالی کی سیاسی تمہید تھی۔ تین دہائیوں تک کے لئے پینڈولم دائیں جانب گیا۔ محنت کش دوبارہ سرد مہری میں مبتلا ہو گئے۔ ہراول پرتیں مایوس اور بدگمان ہو گئیں۔ ایک ایسا دور جسے رجعتی کہا جا سکتا ہے، چھا گیا۔

285۔ ان حالات میں مزدور تحریک کی بالائی پرتوں پر بورژوازی کا دباؤ ہزاروں گنا بڑھ گیا۔ سٹالنزم کے انہدام سے یہ عمل مزید تیز ہو گیا۔ بورژوازی خوشی میں مست تھی۔ انہوں نے بڑھک ماری کہ کمیونزم ختم ہو گیا، سوشلزم ختم ہو گیا اور یہ کہ تاریخ ختم ہو گئی۔ لیکن تاریخ نے بالآخر سرمایہ داروں اور مزدور تحریک میں ان کے معذرت خواہان سے انتقام لیا۔ جدلیاتی طور پر، ہر شے اپنے الٹ میں تبدیل ہو گئی۔

286۔ نتیجہ

287۔ نیا دور جس میں ہم داخل ہوئے ہیں وہ گزشتہ نصف صدی کی بجائے دو عالمی جنگوں کے درمیان کے دور سے مماثلت رکھتا ہے۔ لیکن اہم فرق بھی ہیں۔ 30-1920ء کی دہائیوں میں انقلاب سے پہلے والی صورتحال (Pre Revolutionary) زیادہ عرصہ نہیں چلی۔ یہ تضادات جلد ہی انقلاب یا رد انقلاب کی شکل میں ماند پڑ گئے۔ اٹلی میں 20-1919ء میں فیکٹریوں پر قبضے اور اس کے بعد مسولینی کے روم پر مارچ میں صرف دو سال کا وقفہ ہے۔

288۔ لیکن اب یہ عمل زیادہ طویل ہے۔ اس کی بنیادی وجہ طاقتوں کا تبدیل شدہ توازن ہے۔ بہت سے یورپی ممالک میں 1945ء کے بعد بھی آبادی کا بڑا حصہ کسانوں پر مشتمل تھا۔ یونان میں وہ اکثریت میں تھے۔ اس کی وجہ سے بونا پارٹسٹ اور فاشسٹ رجعت کو قوتیں ملیں۔ طلبہ اور سفید پوش محنت کشوں کی بھی یہی کیفیت تھی جیسے کہ اساتذہ، سرکاری ملازمین، بینکوں کے ملازمین وغیرہ۔ لیکن اب یورپ میں کسان تقریباً ختم ہو چکے ہیں، سفید پوش محنت کش پرولتاریہ میں جذب ہو چکے ہیں اور بہت لڑاکا قوت بن چکے ہیں۔ طلبہ جو 1945ء سے پہلے فاشزم اور رجعت کے لیے ایک ٹھوس بنیاد تھے اب بڑی تعداد میں انقلاب کے ساتھ ہیں۔

289۔اسی وجہ سے یہ بحران فیصلہ کن لڑائی سے پہلے ماضی کی نسبت زیادہ طویل ہوسکتا ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ حالات پرسکون ہو جائیں گے بلکہ اس کے الٹ ہوگا۔سیاسی وسماجی مدوجزر آئیں گے(سرمایہ داری کے نیچے جانے کا مطلب یہ نہیں کہ عروج اور زوال کے چکر کا خاتمہ ہو جائے گا یا عارضی بحالیوں کے امکان ختم ہو گئے ہیں،ایسی بحالیاں 1929ء کے گریٹ ڈپریشن میں بھی ہوئیں تھیں)۔

290۔سرمایہ داروں کے نکتہ نظر سے معاشی چکر کی اونچ نیچ کچھ بھی حل نہیں کرے گی۔معاشی زوال کے لمبے دور اور بیروزگاری کی بڑی شرح کے طویل دور کے بعد ایک چھوٹی سی بھی بحالی(وہ زیادہ سے زیادہ یہی امید کر سکتے ہیں)صنعتی محاذ پر ہڑتالوں میں اضافہ کرے گی اور محنت کش زوال کے دوران لی گئی حاصلات کو واپس لینے کی کوشش کریں گے۔معاشی زوال کے دوران ناگزیر طور پر ہڑتالوں میں کمی آئے گی لیکن سیاسی ریڈیکلائزیشن میں اضافے کا رجحان ہوگا۔

291۔دنیا میں پہلے ہی ہر طرف بے چینی ہے۔ایک مختصر وقفے کے بعد لوگ یہ سمجھنا شروع ہو گئے ہیں کہ جب تک یہ غیر منصفانہ اور ظالمانہ نظام موجود رہے گا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو سکتا۔انقلابی عمل آگے بڑھ رہا ہے،گہرا ہو رہا ہے اور پھیل رہا ہے۔ہڑتالوں اور مظاہروں کی ایک کے بعد دوسری لہر آئے گی جو عوام کے لیے تربیتی میدان ہوگا۔آبادی کی نئی پرتیں ان جدوجہدوں میں شامل ہو رہی ہیں جیسے برطانیہ میں جونیئر ڈاکٹر،یونان میں کسان اور ائرفرانس کے فلائٹ اٹینڈنٹ۔لیکن بحران تا گہرا ہے کہ طوفانی ہڑتالیں اور مظاہرے بھی کچھ حل نہیں کر پاتے۔

292۔صرف سماج میں ایک بنیادی تبدیلی بحران کو حل کر سکتی ہے۔اس کے لیے انقلابی سیاسی عمل کی ضرورت ہے۔سیاسی منظر نامے پر دائیں اور بائیں جانب تیز ترین تبدیلیاں نظر آئیں گی۔موجود پارٹیاں بحرانوں اور پھوٹ کا شکار ہوں گی۔مختلف قسم کی بائیں بازو کی انتخابی شکلیں بن سکتی ہیں۔محنت کش طبقہ سیاسی محاذ سے صنعتی محاذ پر بار بار جائے گا۔محنت کشوں پر نئے اور شدید حملوں کی تیاری کی جا رہی ہے۔طبقاتی جدوجہد سڑکوں پر لڑی جائے گی۔

293۔موجودہ بحران کئی سال جاری رہ سکتا ہے،امکان ہے کہ دہائیوں تک،اس کی وجہ موضوعی عنصر کی عدم موجودگی ہے۔ایک عوامی انقلابی پارٹی جس کی ایک حقیقی مارکسی قیادت

ہو۔لیکن یہ سیدھی لکیر میں آگے نہیں بڑھے گی۔ایک کے بعد دوسرا دھماکہ ہوگا۔صورتحال کے بطن میں اچانک اور تیز تبدیلیاں موجود ہیں۔ایک کے بعد دوسرے ملک میں عوامی تحریکوں اور جدوجہدوں کا تسلسل نظر آئے گا۔پرانی تنظیمیں بنیادوں تک ہل جائیں گی۔یاد کریں کہ صرف 18 ماہ کے دوران پوڈیموز صفر سے 3,76,000 ممبران تک پہنچ گئی تھی۔

294۔ایک کے بعد دوسرے ملک میں آخر کار عوام کہیں گے کہ ''بس بہت ہو گیا''۔لیکن ایک واضح مارکسی انقلابی پالیسی کے بغیر، مارکسزم کے نظریات کے بغیر ہمارے لئے بائیں بازو کے اصلاح پسندوں سے علیحدہ ایک الگ رجحان کے طور پر رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ہماری کامیابی کی شرط یہ ہے کہ ہم اپنی انقلابی پہچان کو قائم رکھیں اور اپنے نظریات کو واضح اور تند رکھیں۔وقتی مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش، جس کے لیے بائیں بازو کے اصلاح پسندوں کا حصہ بنا جائے، اس کا نتیجہ آخر کار رتباہی کی صورت میں نکلے گا۔

295۔عظیم فتوحات کا راستہ بہت سی چھوٹی کامیابیوں سے ہموار ہوتا ہے۔ہمارا کام ہے کہ ابھی ہم ایک ایک دو دو کو جیتیں۔انہیں مارکسی نظریات کی تربیت دیں، محنت کش طبقے اور نوجوانوں کی ہروال پرتوں سے مضبوط روابط قائم کریں اور انکے ذریعے عوام سے تعلق جوڑیں۔واقعات کے ذریعے عوام سیکھیں گے۔وہ نظریات جنہیں آج چند لوگ سنتے ہیں انہیں لاکھوں کروڑوں لوگ دلچسپی سے سنیں گے لیکن اس کا راستہ ہموار کرنے کے لیے مارکسی کیڈروں کی ایک خاطر خواہ قوت درکار ہے جو محنت کش طبقے کی قیادت کے لیے لڑ سکے۔

296۔اس وقت ہم ایک چھوٹی سی اقلیت ہیں۔اس کی بڑی وجہ معروضی تاریخی عوامل ہیں۔پچھلے ایک پورے تاریخی دور میں مارکسزم کی قوتیں محدود اور کمزور تھیں۔ہم موج کی مخالف سمت میں تیر رہے تھے۔لیکن اب تاریخ کا دھارا بدل چکا ہے۔ہمارا فریضہ ہے کہ ہم عالمی سطح پر بالشوازم کی روایات کو دوبارہ زندہ کریں اور طاقتور پرولتاری انٹرنیشنل تعمیر کریں جو پوری دنیا کی تقدیر بدلے گی۔یہ وہ منزل ہے جس کا انتخاب ہم نے کیا ہے۔یہ واحد مقصد ہے جس کے لیے لڑا جا سکتا ہے اور قربانی دی جا سکتی ہے۔محنت کش طبقے کی نجات کا مقدس مقصد۔

297۔لندن 8 جنوری 2016ء